فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	بعثتِ نبویؐ	پروفیسر محمد اکرم طاہر	8
قولِ نبیؐ	تزکیہ کرنے والے نبیؐ (حصہ سوم)	ڈاکٹر آسیہ شبیر	12
خاص مضمون	موج ہے دریا میں بیرون دریا کچھ نہیں	آمنہ نذیر قاضی	16
نوائے شوق	ہائے یہ رات	بنت مجتبیٰ مینا	20
	غزل	نجمہ یاسمین یوسف	21
	غزل	کرامت بخاری	21
	اے ظالم دریا!	رفعت محمود صباؔ	22
حقیقت وافسانہ	وہ دل وہ دیا	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	23
	طوق	قانتہ رابعہ	27
	محرومی	افشاں نوید	30
	پس ہے کوئی جو......	فریدہ خالد	33
	صبح امید	عالیہ شمیم	36
	گمنام سپاہی	حفصہ محمد افضال	38
	ننھی پری	نزہت ظفر	40
سلسلہ وار کہانی	شجر بے ثمر	نصرت یوسف	45
سیر و سیاحت	چندروز امارات میں (دوسرا حصہ)	میمونہ حمزہ	50
ملاقات	کرو مہربانی تم اہل زمیں پر	آسیہ راشد	55
مطالعہ گاہ	میری لائبریری سے	قانتہ رابعہ	60
	وہ امانت کا رکھوالا	شیخ راحیل وارث	64
انشائیہ	کچھ تو ادھر بھی!	شمیم فاطمہ	66

ابتدا تیرے نام سے

قارئینِ کرام! عید گزری۔۔۔مگر کیسی۔۔۔کہ آنکھوں کے آگے مسلے ہوئے پھول لہراتے رہے۔۔۔لہو رنگ مناظر۔۔روندے ہوئے بدن۔۔روتی کُرلاتی مائیں۔۔۔ملبے کے ڈھیر۔۔۔کھیلتے ہوئے بچوں کا تاک تاک کر نشانہ لیتے ہوئے میزائل۔۔۔ہسپتالوں، سکولوں، بازاروں، پناہ گاہوں پر بمباری۔۔۔انسانی شقاوت کے نئے معیارات۔۔۔درندگی کے نئے گراف۔۔۔نفرت، حسد اور بغض کی نئی داستانیں رقم کرتے ہوئے سانحے۔۔۔''مہذب دنیا'' کی وحشت و بربریت اور حیوانیت کے تازہ مظاہرے۔۔۔صرف اس لیے کہ غزہ کی محصور آبادی اس نبی ﷺ کی امت سے ہے جو آلِ اسحاقؑ سے نہیں بلکہ آلِ اسماعیلؑ سے تھے!!

اے خاصۂ خاصانِ رُسل! وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

یہ ظلم جہاں ہر خطے میں موجود صالح فطرت عناصر کی آنکھیں نم کر رہا ہے، وہیں دنیا میں بہت سوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے بھی کافی ہے کہ اس دنیا کو اصل خطرہ کس سے ہے اور اصل میں دہشت گرد کون ہیں۔آج دنیا کے امن اور مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ صیہونیت کے علمبردار ہیں، جن کے امتِ مسلمہ سے بغض کا عالم یہ ہے کہ ان کی ایک ممبر پارلیمنٹ علی الاعلان کہہ رہی ہے کہ تمام فلسطینی ماؤں کو مار دیا جائے تاکہ وہ ''دہشت گرد'' پیدا نہ کریں۔اس بیان سے نہ صرف ان کی دہشت گردی کی تعریف واضح ہو رہی ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ مغرب کی یہ بدنام وار آن ٹیرر کن دہشت گردوں کے خلاف ہے، وہ کون لوگ ہیں جو نہتے ہونے کے باوجود ان کے لیے دہشت کا باعث ہیں، اور یہ دہشت کس بات کی ہے۔اداؔ جعفری کی یہ سطور نہ جانے کس زمانے کی ہیں مگر اہلِ فلسطین کی زندگی تو اعلانِ بالفور سے اب تک درد کا عنوان ہی بنی رہی ہے۔

ایسا اندھیر تو پہلے نہ ہوُا تھا لوگو
لو چراغوں کی تو ہم نے بھی لرزتے دیکھی
آندھیوں سے تو یہ سورج نہ بجھا تھا لوگو
قافلے لٹتے ہی رہتے ہیں گزرگاہوں میں
لوٹنے والوں نے کیا عزمِ سفر بھی لوٹا
دجلۂ خوں تو نئی بات نہیں ہے ، یہ کہو
وہ جو ڈوبا ہے سفینہ ہے کہ ساحل ڈوبا
مٹ نہ پائے تھے بگولوں سے نقوشِ کفِ پا
ان رہوں میں ہیں رسولوں کے نقوشِ کفِ پا
محترم ہے مجھے اس خاک کا ذرہ ذرہ
ہیں یہاں سرورِ کونین کے سجدوں کے نشاں

اس ہوا میں مرے آقا کے نفس کی خوشبو
اس حرم میں مرے مولا کی سواری ٹھہری

اس ظلم سے بڑا ظلم ۔۔۔اہلِ غزہ کی بے کسی پر عرب حکمرانوں کی بے حسی ہے، جن کے سرمائے سے یورپ کے بنک چلتے ہیں اور جن کے تیل سے اہلِ کفر کی بستیاں روشن ہیں ۔ نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق مصر کی سربراہی میں مصر، اُردن، سعودی عرب اور امارات کا نیا اتحاد تشکیل پا گیا ہے جو حماس کے مقابلے میں اسرائیل کے ساتھ ڈٹ کر کھڑا ہے۔ رپورٹ میں یہ خدشہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ غزہ میں اتنی ہلاکتوں کے بعد بھی جنگ بندی کی شرائط منوانے میں حماس کی ناکامی کے پیچھے جنرل مرسی کا ہاتھ ہے، اور یہ کہ عرب حکمرانوں کی ''سیاسی اسلام'' سے خوفزدگی اس قدر شدید ہے کہ اس کی خاطر انہیں بنجمن نیتن یاہو بھی گوارا ہے۔ مصر میں اخوان المسلمون کی مقبول اور منتخب عوامی حکومت کا تختہ الٹ کر یہودیوں کے طرفدار کو اسی لیے مسلط کیا گیا تھا تا کہ اسرائیل کی درندگی کو روکنے والا کوئی نہ ہو۔ اسرائیل کی بزدلی کی یہ انتہا ہے کہ حماس کے راکٹوں سے جہنم رسید ہونے والے اپنے فوجیوں کا بدلہ وہ شہری آبادیوں پر حملوں سے لے رہا ہے۔ دنیا کے کسی ضابطے میں فوج کا بدلہ شہریوں سے لینا جائز نہیں مگر غزہ کے مسلمان دنیا کے کسی قانون کے تحت نہیں آتے۔ اب تک ڈیڑھ ہزار سے زیادہ بے گناہ فلسطینی شہری شہید ہو چکے ہیں اور اسرائیل کی وحشت ختم نہیں ہوئی۔ یورپ بھر میں عوامی احتجاج زوروں پر ہے اور کھلے الفاظ میں اپنی اپنی حکومتوں کی اسرائیل نوازی پر تنقید ہو رہی ہے۔

دوسری طرف مسلمان ملکوں میں عوام کے اندر غم وغصہ ابل رہا ہے مگر وہ اپنی اپنی کٹھ پتلی حکومتوں کے آگے بے بس ہیں۔۔۔ مفاد پرست، بدعنوان، بے حمیت، نا اہل اور بزدل حکومتیں۔۔۔۔ کسی اسلامی ملک کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اسرائیل کو منافع میں سے حصہ دینے والی کمپنیوں کی مصنوعات کا بائیکاٹ کرتی۔ عوامی سطح پر ایسے بائیکاٹ چند روز چلتے ہیں کیونکہ ان کے پیچھے حکومتی حمایت نہیں ہوتی۔ ہم سے تو بھارتی مسلمان زیادہ باحمیت نکلے کہ مسلمانوں کے آٹھ سو سے زیادہ ریستورانوں نے یہودی مشروبات کا بائیکاٹ کر دیا۔ ترکی میں بھی یہی کیا گیا ہے۔ مگر ہمارے ہاں لیڈر شپ کا ایسا فقدان ہے کہ قوم کے جذبات کو اس وقت ایک رُخ دینے کی بے حد کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ کڑھ رہا ہے اور بے بس ہے۔ الخدمت، پیما اور ان جیسی دیگر فلاحی تنظیمیں قابلِ داد ہیں جو غزہ میں ہر قسم کی امداد پہنچانے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ یہ مالی مدد کم سے کم فرض ہے جو اس وقت ادا ہو سکتا ہے۔ کاش کہ ایک مسلم نیوکلیائی طاقت اس نازک وقت میں مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے بڑھ کر بھی کام آ سکتی!

خارزاروں کو کسی آبلہ پا کی ہے تلاش
وادیِ گل سے ببولوں کا خریدار آئے
ریگ زاروں میں کوئی تشنہ دہن آ جائے
ہوش والو! کوئی تلقینِ جنوں فرمائے!

آئی ڈی پیز ہنوز اپنے گھروں کو سلامتی سے لوٹ جانے کے منتظر ہیں۔ رمضان المبارک میں قدرے امن وامان رہا، اگرچہ کوئٹہ کے بازار میں بم دھماکے نے کئی زندگیوں کو نگل لیا۔ عید کے روز کراچی کے ساحل پر خوشیاں منانے والے کئی لوگ بے احتیاطی اور عدم انتظامات کے باعث سمندری لہروں کی نذر ہو گئے۔ اللہ لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے، آمین۔

دعا گو

صائمہ اسما

بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

پروفیسر محمد اکرم طاہر

اخلاقی اصولوں کی بحث سے ہٹ کر دیکھا جائے تو اسلام میں اخلاقیات کوئی نظری وفکری مسئلہ نہیں، پوری عملی زندگی کا دستور ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ عالیہ کی مدح وتوصیف کرتے ہوئے خود رب ذوالجلال نے فرمایا: وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ (القلم ۴) ''اور بے شک آپؐ اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔'' علمائے کرام نے یہاں ایک خاص نکتے پر زور دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا وان لک خلقا عظیما اس کا مطلب فقط یہ ہوتا کہ آپؐ کے اخلاق اعلیٰ درجے کے ہیں۔ اس کے بجائے وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ کا پیرایہ بیان استعمال ہوا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ آپؐ کو اعلیٰ اخلاق پر قدرت حاصل ہے۔ بالفاظ دیگر آپؐ سے اخلاق عالیہ کا فطری طور پر ظہور ہوتا ہے۔ سیرتِ پاکؐ کے ذخیرہ سے منتخب کردہ مندرجہ ذیل واقعات اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقیات باتکلف (Laboured) نہیں بلکہ بے ساختہ (Spontaneous) تھیں۔

(الف) فتح مکہ کے موقع پر جب عکرمہ بن ابوجہل قبول اسلام کے لیے آرہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین کو پہلے سے تاکید کر دی کہ کوئی شخص بھی ان کے باپ کے حوالے سے ان کا ذکر نہ کرے۔ اس لیے کہ مردوں کے حوالے سے زندہ لوگوں کی دل آزاری جائز نہیں۔

(ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ہمراہ ایک سفر میں تھے۔ چند اونٹنیاں ادھر ادھر چر رہی تھیں اور اُن کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ بعض نومسلم صحابہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے ان اونٹنیوں کی طرف دوڑے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فوراً واپس پلٹ آنے کا حکم دیا اور فرمایا: ''ان اونٹنیوں کے مالکوں کی روزی کا دارومدار اللہ کے بعد اُن کے دودھ پر ہے۔ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ اپنا توشہ دان ایک جگہ رکھ کر کہیں جاؤ اور واپس آ کر دیکھو کہ کوئی شخص اُن میں سے کھانے کا سامان لے اڑا ہے؟'' (ابن ماجہ)

(ج) ایک غزوہ میں کافروں کے چند بچے مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ کو شدید رنج ہوا۔ ایک صحابی نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ تو مشرکوں کے بچے تھے۔ آپؐ نے پھر اصرار کیا اور فرمایا: خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو۔ بچوں کو قتل نہ کرو۔ ہر جان اللہ ہی کی فطرت پر پیدا ہوئی ہے۔ (مسند احمد، ج ۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا اثر تھا کہ صحابہ کرام عام حالات میں ہی نہیں، عین حالت جنگ میں بھی عظمت انسانی کے پرچم کو سربلند رکھتے۔ غزوۂ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے حضرت ابودجانہؓ کو ایک تلوار عطا فرمائی۔ انھوں نے اس تلوار سے بہادری اور جواں مردی کے خوب جوہر دکھائے۔ یہ تلوار اس وقت رکی جب اس کی زد میں ایک مشرکہ آ گئی جو اپنے سورماؤں کے لیے رجز گا رہی تھی۔ حضرت ابودجانہؓ کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کردہ تلوار کسی عورت کے قتل سے خون آلود ہو۔ آپؐ کی مسلسل تربیت سے صحابہ کرام کی زندگی میں جو انقلاب عظیم رونما ہوا، رب ذوالجلال نے خود قرآن حکیم میں اس کی مدح سرائی کی:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

''وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔''

مفسرین کے مطابق یہ آیت انصارِ مدینہ کے حق میں نازل ہوئی تھی۔ کچھ دوسرے مفسرین نے اس آیت کے شانِ نزول میں ایک ایمان افروز واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ ایک دفعہ ایک مسافر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں تشریف لائے۔ آپؐ نے گھر پیغام بھجوایا مگر اس وقت امہات المومنین میں سے کسی کے گھر میں سوائے پانی کے کچھ نہ تھا۔ آپ نے موجود صحابہ کو ایک رات کے لیے مہمانِ مذکور کو اپنے ہاں ٹھہرانے کی دعوت دی۔ ایک صحابہ مہمان کو گھر لے گئے۔ بیوی نے بتایا کہ موجود کھانا صرف اُن کے اپنے بچوں کی بمشکل کفالت کرسکتا ہے۔ دونوں میاں بیوی نے طے کیا کہ بچوں کو بہلا کر سلا دیا جائے اور چراغ بجھا کر مہمان کی خدمت میں کھانا پیش کیا جائے۔ مسافر کھانا کھائے گا۔ اہل خانہ اندھیرے میں ہاتھ منہ چلائیں گے اور مسافر کو ذہنی کوفت نہ ہوگی۔ وہ یہی سمجھے گا کہ میاں بیوی بھی کھانے میں شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اُن کا یہ عمل اس قدر پسند آیا کہ قرآن پاک میں صیغۂ جمع استعمال کرتے ہوئے اس واقعہ کو مہمان نوازی کی ایک اجتماعی روایت بنا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی اعجاز یہ بھی ہے کہ آپؐ کی اخلاقی تعلیمات کو بروئے کار لا کر آج بھی حسنِ عمل کی قندیلیں جا بجا روشن کی جاسکتی ہیں۔

(۶) دنیا بھر میں خوشنما اخلاقی تصورات کی کبھی کمی نہیں رہی۔ اصل کمی ان تعلیمات پر عمل کرنے والوں کی ہے۔ کہتے ہیں ایک مسلح شخص نے مہاتما بدھ کی تعلیمات کا جوہر حاصل کرنے کے لیے طویل سفر کیا۔ بالآخر ایک نامور بھکشو نے بدھ کی تعلیمات کا خلاصہ کچھ یوں بیان کیا۔ ’’ہر قسم کے شر سے بچو۔ ہر قسم کے خیر پر عمل کرو اور اپنے خیالات ہمیشہ پاک صاف رکھو۔‘‘ اس شخص نے کہا۔ کوئی خاص بات بتاؤ۔ یہ باتیں تو پانچ برس کا ایک بچہ بھی بخوبی جانتا ہے۔ بھکشو نے کہا۔ جی ہاں ایسا ممکن ہے۔ لیکن اسی برس کے بھی چند لوگ ہی ایسے ہوں گے جو ان باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو گندم نما جو فروش قسم کے مذہبی پیشواؤں کے بارے میں اپنے شاگردوں سے کہنا پڑا: ’’پس جو کچھ وہ تمھیں بتائیں، وہ سب کرو۔ مگر جو کام وہ کرتے ہیں وہ نہ کرو۔‘‘ قرآن پاک میں اہل کتاب کے مذہبی پیشواؤں کے قول و فعل میں تضاد کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا گیا: مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ’’جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا تھا، اُن کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں۔‘‘

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوۂ حسنہ سے ایمان اور عمل صالح میں حائل دوریاں بھی مٹا ڈالیں۔ صحابہ کرامؓ قول و فعل کی یکجائی کا مثالی نمونہ تھے۔ آپؐ نے اُن کے علم و عمل کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا: ’’میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ تم اُن میں سے جس کی بھی پیروی کروں گے، ہدایت پاؤ گے۔‘‘ صحابہ کرامؓ اچھی طرح جانتے تھے کہ اسلام میں ایمان کے بغیر عمل اور عمل کے بغیر ایمان غیر معتبر ہیں۔ اب مذہب کچھ بے جان رسوم و رواج اور بے روح عبادات (Rituals) کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت اور ایک زبردست قوت حیات بن گیا۔ قرآن و حدیث میں عبادت کے ایسے روایتی تصور پر کڑی تنقید کی گئی ہے جو فرد کے عمومی مزاج اور اجتماعی کلچر کا حصہ نہیں بنتا۔ حدیث پاک میں ایک گروہ کے متعلق آتا ہے کہ وہ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے (بخاری، مسلم، موطا) قربانی کے متعلق قرآن پاک میں ہے لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ’’اللہ تک تمھارے جانوروں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، وہاں تو تمھارا تقویٰ ہی مقبول ہوتا ہے۔‘‘ (الحج: ۳۷) نماز و روزہ جیسے بنیادی ارکانِ اسلام کی رسمی ادائیگی پر یقین رکھنے والوں کے لیے حدیث پاک ہے۔ ’’بہت سے نماز پڑھنے والے ایسے ہیں جنھیں نماز سے اٹھنے بیٹھنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جن کے حصے میں بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں آتا۔‘‘ اہل عرب جو موہوم بنیادوں پر چند افعالِ خیر مثلاً مسجد حرام کی مجاوری اور حاجیوں کو پانی پلانے کو مدارِ نجات سمجھے ہوئے تھے۔ ان کی اصلاح کے لیے سورۃ التوبہ (۱۹-۲۰) میں فرمایا گیا کہ تم لوگ اللہ کے نزدیک ان لوگوں کے برابر نہیں ہوسکتے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اللہ کی راہ میں ہجرت کرتے ہیں اور اپنے جان و مال سے جہاد کرتے

ہیں۔اسی طرح سورۃ البقرہ کی مشہور آیت البر (۱۷۷) میں بھی واضح کر دیا گیا کہ مشرق ومغرب کی جانب منہ کر لینے سے کوئی شخص نیک نہیں بن جاتا۔اسلام میں نیک وہ شخص ہے جو عقائد، معاملات اور عبادات کے لحاظ سے نیک ہو۔

''نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک لوگ وہ ہیں جب عہد کریں تو اُسے وفا کریں اور تنگی ومصیبت کے وقت میں اور حق وباطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔''

آیت البر کے بارے میں اس امر کو جاننا بھی ضروری ہے کہ یہ آیت تحویل قبلہ کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔مسلمانوں کو بیت المقدس کے بجائے کعبۃ اللہ کی جانب رخ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم ہوا تو مدینہ کے اہل کتاب بالخصوص یہود نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ان کا کہنا تھا یہ کیسا مذہب ہے جس میں سرِ شام قبلہ کسی طرف ہوتا ہے اور اگلی ہی صبح یہی قبلہ کسی دوسرے رخ کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔اس سیاق وسباق میں اہل کتاب کے اعتراض کا جواب بھی دیا گیا اور ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی کھول کر بیان کر دیا گیا کہ عبادات کی ظاہری اشکال کو مشینی انداز میں دہرادینے سے کوئی شخص نیک نہیں بن جاتا۔نیکی تو ایک جامع اصطلاح ہے۔موضوع کی نزاکت اور مناسبت سے اس آیت میں معاملات کو عبادات سے بھی پہلے بیان کیا گیا۔

(۷) نبیا کرام نے اپنی صداقت کے ثبوت میں بہت سے معجزات بھی پیش کیے تھے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے اولین مخاطبین کے لیے بے شمار معجزات پیش کیے۔ بدقسمتی سے مستشرقین کے ایک گروہ نے ان معجزات کا سراسر انکار کر دیا۔فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر گستاؤلی بان کا تعلق بھی اسی گروہ سے ہے۔اس کا دعویٰ ہے:

''اگر چہ محمد ﷺ اپنے کو پیغمبر خدا اور نبی برحق سمجھتے تھے۔ پھر بھی آپ نے کبھی معجزے کا دعویٰ نہیں کیا۔لیکن چونکہ از روئے روایت نبی کے لیے معجزہ کا ہونا ضروری ہے لہٰذا مورخین اسلام نے آپ کی طرف بھی چند معجزے منسوب کیے ہیں۔''

معجزاتِ نبوی کے منکر اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ان معجزات کا تعلق چند خوش عقیدہ راویوں کے ''جوشِ انتساب'' سے ہرگز نہیں ہے۔ یہ معجزات بھی انہی مستند راویوں سے مروی ہیں جو سیرتِ پاک کے بارے میں ہماری بنیادی اور ضروری معلومات کا ماخذ ہیں اور جن کی ثقاہت کو قبول کیے بغیر کوئی مسلم بلکہ کوئی غیر مسلم سیرت نگار بھی دوگام آگے نہیں بڑھ سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ معجزات کے باب میں بھی اپنی ایک انفرادی اور امتیازی شان رکھتے ہیں گزشتہ انبیا کرام کے معجزات کے عینی شاہد متعلقہ علاقوں اور زمانوں کے لوگ تھے۔ایسے معجزات کا علم آج ہمیں چند بچے کھچے صحائف آسمانی کے ذریعے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے بہت سے معجزات کا تعلق بھی عصری مخاطبین سے تھا۔ تاہم حق تعالیٰ نے قافلۂ راہِ ہدایت کے آخری حدی خواں ﷺ کو قرآن حکیم کی صورت میں سب سے بڑا اور زندہ جاوید معجزہ بھی عطا فرمایا۔ بلاشبہ دریاؤں کا رخ موڑ دینا اور مردوں کو زندہ کر دینا بڑے معجزے ہیں۔لیکن انسانی سوچ کے دھارے کا رخ موڑ دینا اور مردہ دلوں کو زندہ کر دینا ان سے بھی بڑا معجزہ ہے۔اس معجزے کی بدولت صدیوں پر محیط روایات و تعصّبات کے اسیر پتھر دل موم ہو گئے اور پیکرانِ محسوس کی عبادت کے خوگر انسان ایک حیی وقیوم مگر ان دیکھے اللہ کے اطاعت گزار بندے بن گئے۔

عقیدۂ توحید پر مبنی اس ذہنی وفکری انقلاب کا ایک منظر اہل دنیا نے وصالِ نبوی ﷺ کے موقع پر بھی دیکھا تھا۔صحابہ کو حضور ﷺ سے جو محبت وعقیدت تھی اس کی کیفیت صلح حدیبیہ سے پہلے قریش کے ایک سفیر عروہ بن مسعود ثقفی (جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے) نے اہل مکہ کے سامنے

کچھ یوں پیش کی تھی:

''محمد (ﷺ) جب وضو کرتے ہیں تو مسلمان ان کے غسالہ کو زمین پر گرنے سے پہلے اپنے ہاتھوں میں لینے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ جب وہ بات کرتے ہیں تو اب کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں۔ ادب واحترام کی وجہ سے وہ انھیں آنکھ بھر کر دیکھتے نہیں ہیں۔''

دنیا و مافیہا سے محبوب تر اس شخصیت ﷺ کے انتقال کی خبر ان پر برقِ تپاں بن کر گری۔ آنِ واحد میں دنیا ان کے لیے گویا اندھیر ہوگئی۔ حضرت عمر فاروقؓ جیسے مردِ آہن کے اعصاب جواب دے گئے۔ انھوں نے تلوار نیام سے باہر نکالی اور کہا ''جو شخص کہے گا کہ محمد ﷺ فوت ہو گئے ہیں میں اس تلوار سے اس کی گردن مار دوں گا۔ عین اس نازک موقع پر سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی آواز گونجی: ''اے لوگو! جو شخص محمد ﷺ کو پوجتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد ﷺ تو فوت ہو گئے۔ لیکن جو شخص اللہ کی عبادت کرتا ہے تو یقیناً اللہ زندہ ہے اور اس پر کبھی موت وارد نہ ہوگی۔'' اس اندوہناک موقع پر قولِ صدیق جزوی طور پر ہی کارگر ہو سکتا تھا۔ ان کے ہاں مکمل خود سپردگی قرآن وسنت کی سند کے ساتھ مشروط تھی۔ اللہ کے محبوب پیغمبر اور اُن کے ہادی ورہنما ﷺ نے ان کی تربیت ہی اسی نہج پر کی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بڑھ کر مزاجِ صحابہ کا رمز شناس کون ہو سکتا تھا۔ لوہا گرم تھا۔ وہ آگے بڑھے اور قرآن کی ایک آیت سے وہ ضرب لگائی جسے سنتے ہی نگاہوں پر سے تمام پردے ہٹ گئے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کو یوں لگا جیسے یہ آیۂ مبارکہ آج اور اسی موقع کے لیے نازل ہوئی ہو:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (آل عمران:۱۴۴)

''محمد اللہ کے رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔ اگر وہ وفات پا جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل کفر کی جانب پر لوٹ جاؤ گے؟ اور جو شخص اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے وہ اللہ کو ذرا بھی ضرر نہیں پہنچا سکتا اور عنقریب اللہ شکر گزار بندوں کو نیک بدلہ دے گا۔''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں مدینہ منورہ میں ہر شخص کی زبان اس آیت کا ورد کر رہی تھی۔ اب صحابہ کرامؓ کو احساس ہوا کہ نہ صرف درِ یتیم ﷺ کی امت یتیم ہوگئی ہے بلکہ آپ کی محبت شاقہ سے قائم ہونے والی ریاست بھی لاوارث ہوگئی ہے۔ اسلام دشمن طاقتیں آپ کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا سے بہت کچھ توقعات وابستہ کیے ہوئے تھیں۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ابتدا ہی میں مرتدین، معانین زکوٰۃ اور باغی قبائل کی سرکوبی کے لیے جو ہمہ جہتی اور ہمہ وقتی جنگ لڑنا پڑی، اس سے حالات کی سنگینی کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مذکورہ آیت مبارکہ کی سماعت کے بعد صحابہ کرامؓ یکسو ہو گئے کہ عقیدۂ توحید پر مبنی حکومت کا تسلسل اور استحکام کس قدر فوری اقدام کا متقاضی ہے۔ یہی موقع تھا جب غم واندوہ کے طوفان اور حزن وملال کے سیلاب کو اپنے اپنے سینوں میں دبائے یہ نفوسِ قدسیہ سقیفہ بنی ساعدہ میں پرامن انتقال اقتدار کے لیے شرعی حکم کے مطابق باہم مشاورت کے لیے جمع ہو گئے۔

یہ وہ زبردست انقلاب تھا جو حضور اکرم کی صحبت میں رہنے سے صحابہ کرام کے اندر پیدا ہو چکا تھا۔

اللّٰھم صل علی محمد و علی آلِ محمد۔

(ختم شد)

☆......☆......☆

ڈاکٹر آسیہ شبیر

تزکیہ کرنے والے نبی ﷺ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ تعلیمی:

دور جدید میں جن تدریسی مہارتوں اور طریق کار (Teaching Skills and Methodologies) کو اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت کے اداروں میں باقاعدہ کلاسوں کی صورت میں سکھایا جا رہا ہے، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرت انبیاء کرام علیہم السلام کا ایک ادنی طالب علم بھی جانتا ہے کہ یہ تدریسی اسلوب، اور یہ مطلوب صفات تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا خاصہ تھیں۔ اور خاص طور پر عالم انسانیت کے آخری معلم کو ان صفات سے بدرجہ اتم مزین کیا گیا۔

اے کہ برتخت سیادت، زازل جاداری

آنچہ خوباں ہمہ دارند، تو تنہا داری

تزکیے کی روح میں گندھی اس تعلیم نے دنیا کا سب سے زیادہ پائیدار اور انسانیت کے لئے نافع انقلاب برپا کیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ تعلیمی میں جامعیت ہے۔ کتب حدیث کے سینکڑوں اوراق اس پر شاہد ہیں۔ اس مختصر مضمون میں بس اتنا مطلوب ہے کہ وہ چند نمایاں ترین خصائص جو دورِ جدید کی تعلیمی حکمت عملی کے ماہرین، ایک بہترین استاد کے لیے تجویز کرتے ہیں، ان کی محض ایک جھلک اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں دکھائی جا سکے۔

1۔ تدریس پیشہ نہیں، مشن ہو:

ایک اچھے استاد کی خوبیوں میں سرفہرست یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ تدریس کو صرف پیشہ ورانہ ذمہ داری نہ سمجھے، بلکہ یہ اس کا مشن ہو۔ قصص الانبیاء میں قرآن مجید نے ہر نبی کی زبان سے کہلوایا ہے کہ میں اس کار نبوت پر تم سے کسی اجر کا خواہاں نہیں ہوں۔ (ھود) یہی اسوہ نبی مہربان کا بھی رہا ہے۔ اجر تو بہت دور کی بات ہے، قرآن مجید نے اہل ایمان کی ہدایت اور بھلائی کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے "حریص علیکم" (التوبہ) ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ جنھوں نے ایمان قبول نہیں کیا، ان کیلئے آپؐ کی قلبی کیفیات کیا تھیں، بیان الٰہی سے بڑھ کر کون سے الفاظ یہ نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ عَلٰۤی اٰثَارِھِمۡ اِنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِھٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَسَفًا (الکہف۔ ٦)

"تو اے نبیؐ شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔"

جان گھلا دینے کی اس کیفیت سے نکالنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نصیحت فرمائی کہ اگر یہ منہ پھیریں تو آپ ان کے نگران اور ان کی گمراہی کے ذمہ دار نہیں ہیں۔

فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡھِمۡ حَفِیۡظًا اِنۡ عَلَیۡکَ اِلَّا الۡبَلٰغُ (الشوریٰ۔ ٤٨)

"اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو اے نبیؐ ہم نے تم کو ان پر نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم بخوبی جانتے تھے کہ ہدایت دینا صرف اللہ ہی کا کام ہے اس کے باوجود اپنے مخاطبین کے ایمان کے لئے جس قدر مشتاق تھے، اس پر بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبت بھرا زجر اور تنبیہ کی گئی۔

وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ(الانعام۔۳۵)

''تاہم اگران لوگوں کی بے رخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اوران کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو۔اگراللہ چاہتا توان سب کوہدایت پرجمع کرسکتا تھالہٰذانادان مت بنو۔''

یہ عتاب درحقیقت نہ ماننے والوں پرتھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پرنہیں۔جیسا کہ اگلی آیت میں واضح کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ(الانعام۔۳۶)

''دعوت حق پرلبیک وہی لوگ کہتے ہیں جوسننے والے ہیں۔رہے مُردے تو وہ تواب قبروں سے اٹھ کراللہ کے حضورہی پیش کیے جائیں گے۔''

دعوتی زندگی کے مشکل ترین مراحل میں بھی آپؐ کی یہ خصوصیت ماندنہیں پڑتی دکھائی دیتی۔اہل طائف نے آپؐ سے جوسلوک کیا،خودآپؐ نے حضرت عائشہؓ کے سوال پراسے اپنی زندگی کاسخت ترین دن قراردیا۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کواختیاردیا گیا کہ یہ لوگ مبتلائے عذاب کیے جائیں اگرآپؐ چاہیں۔لیکن آپؐ کا جواب ایک پرسوز داعی کے دلی جذبات کاآئینہ دار ہے۔

بل ارجو ان يخرج الله من اصلابهم من يعبد الله وحده لايشرک به شيئا (بخاری شریف)

''بلکہ میں امید کرتا ہوں کہ انہی کی نسل سے ایسے لوگ اٹھیں گے جوخدائے واحد کی بندگی کریں گے اوراس کے ساتھ کسی کوشریک نہیں کریں گے۔''

احد کے مشکل اورصبرآزماموقع پرتکلیف کے باوجود آپؐ نے جوکچھ فرمایاہے۔وہ بس اتنا تھا۔

اللّٰهم اهد قومی فانهم لا يعلمون. (طبقات ابن سعد)

''یااللہ میری قوم کوہدایت دے یہ جانتے نہیں ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے احکام وہدایات کی تعلیم دینے کی جوذمہ داری آپؐ پرڈالی گئی تھی،اس کی ادائیگی کے ذوق وشوق،اضطراب اوراس راہ میں ذاتی تکالیف اورمصائب کوخاطر میں نہ لانے کی اورصبروتحمل کی اس سے بڑی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

2۔طلبہ سے مضبوط شخصی روابط:

طالب علموں سے استاد کے ذاتی روابط،افہام وتفہیم میں آسانی پیدا کرتے ہیں۔بے تکلفی کی فضا میں سوال کرنا آسان اورمخاطب کوجاننے کی وجہ سے ذہنی سطح کے مطابق جواب دیناممکن ہوتا ہے۔آج کی تدریسی مہارتوں میں یہ ہنر پیدا کرنے کے کئی طریقے سکھائے جارہے ہیں۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اپنی ساتھیوں سے محبت اورمحبوبیت کے مناظر جابجاملتے ہیں۔

نبی مہربان کے اخلاق ومعاملات اورمنصب نبوت ورسالت کی وجہ سے آپ کے اصحاب پرتو محبت لازم وواجب تھی۔لیکن آپؐ جس والہانہ انداز میں محبت فرماتے اوراس کااظہار۔۔۔۔اس نے بھی صحابہ کوآپؐ کاگرویدہ بنادیا تھا۔

حضرت زیدؓ بن حارثہ نے آپؐ کواپنے والدین پرترجیح دی تھی۔آپؐ نے انہیں متبنٰی بنالیااورجب تبنیت کی ممانعت آئی توفرمایا:زید مجھے سارے انسانوں میں محبوب ہیں۔(مسلم شریف) ان کے بیٹے اسامہ بن زید''حب رسول الله،محبوب رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم مشہور تھے۔(بخاری شریف) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ،حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے لیے فرماتے ہیں کہ ہم انہیں اہل بیت میں سے سمجھتے تھے،رسول اللہؐ کے گھر بہت آمدورفت کی وجہ سے اوراپنی عادات واطوار میں نبیؐ سے مماثلت کی وجہ سے۔(بخاری شریف) یہ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:نبی کریمؐ نے مجھے اس طرح تشہد سکھائی جیسے آپؐ مجھے قرآن کی سورت سکھاتے تھے اوراس وقت میری ہتھیلی آپ کی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تھی۔(بخاری شریف)

ہجرت کے بعد جب آپؐ مدینہ میں بس گئے تو انصار کے ساتھ محبت کا معاملہ رکھا۔ایک مرتبہ جب ان کی عورتیں اور بچے کسی شادی کی تقریب سے واپس آ رہے تھے۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور تین مرتبہ فرمایا: اللھم انتم احب الناس الیّ۔(بخاری شریف) سعد بن معاذؓ،سیّد اوس تھے۔ایک موقع پر تشریف لائے تو نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قوموا الی خیرکم اوسیّدکم۔(بخاری شریف) یہ اس حال میں فرمایا کہ آپؐ اپنے لیے بھی اپنے ساتھیوں کے کھڑے ہونے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔حضرت خالد بن ولیدؓ سپاہیانہ صلاحیتوں میں ممتاز تھے۔آپؐ نے انہیں 'سیف من سیوف اللہ' (بخاری شریف) کا خطاب دیا۔حضرت معاذ بن جبلؓ کے ہاتھ کو تھام کر فرمایا: اے معاذ! اللہ کی قسم میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔اور میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ کسی فرض نماز کے بعد یہ کہنا نہ چھوڑنا: **اللّٰھم اعنی علی ذکرک و شکرک و حسن عبادتک** (ابوداؤد) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے شانے کو تھام کر فرمایا: کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیلی (بخاری شریف) اتنی محبت سے کہی جانے والی بات کون سا شاگرد فراموش کر سکتا ہے۔

مسائل اور پریشانی کے معاملات میں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اپنے ساتھیوں پر کئی گنا بڑھ جاتی۔حضرت جابر بن عبداللہؓ کے والد غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے۔یہ کم سن تھے۔والد قرض اور بہت سی بہنوں کی ذمہ داری ان پر چھوڑ گئے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی غیر معمولی خبر گیری رکھتے۔جابرؓ نے شادی کی تو بطور خاص پوچھا: کنواری سے کی ہے یا شادی شدہ سے؟ یہ بھی فرمایا کہ باکرہ سے کرتے۔(ابوداؤد) ان کے قرض کا معاملہ تھا تو خود جا کر کھجوریں تلوا کر قرض خواہوں میں تقسیم کیں تا کہ برکت ہو۔(بخاری شریف) جابرؓ فرماتے ہیں: یوں کھجوریں بچ بھی گئیں۔ایک سفر میں ان سے اونٹ خریدا، جو بہت کم رفتار تھا۔مدینے جا کر قیمت بھی واپس فرما دی اور اونٹ بھی انہیں ہی عطا فرما دیا۔(الترمذی) جابرؓ فرماتے ہیں: اونٹ والی رات آپؐ نے میرے لیے پچیس مرتبہ استغفار فرمایا۔(الترمذی)

یہ محبت عام تھی۔مدینہ میں آ کر جب مسلمانوں کو کشادگی حاصل ہوئی تو آپؐ نے فرمادیا کہ جو مسلمان قرض چھوڑ کر وفات پائے گا، اس کے قرض کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔(بخاری شریف) ایک قبیلے کے مفلوک الحال لوگ مدینے آئے تو نبیؐ بے قرار ہو گئے۔منبر پر جا کر خطبہ دیا۔جب ان کے لیے کافی سامان اکٹھا ہوا تو آپؐ کی بے قراری دور ہوئی۔(مسلم شریف)

اس محبت اور محبوبیت کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ ہمہ تن آپؐ کی طرف متوجہ رہتے تھے۔وہ جب حدیث نبوی بیان کرتے تو ساتھ نبی کریمؐ کی کیفیات کا نقشہ بھی کھینچتے۔آپؐ مسکرائے، آپؐ غصے میں تھے، آپؐ کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے وغیرہ وغیرہ۔یہ محبت نہ ہوتی تو جیسا بیان سیرت وحدیث آج مسلمانوں کو میسر ہے، وہ نہ ہوتا۔اسی محبت نے انہیں نبی کریمؐ کے مقاصد سے جوڑ دیا تھا۔۔۔اور اس جدوجہد سے، جس کی راہ میں بے پناہ مصائب تھے۔غزوہ بدر سے پہلے نبی کریمؐ نے اپنے اصحاب سے مشاورت کی۔مہاجرین میں سے حضرت مقداد بن اسودؓ کھڑے ہوئے اور فرمایا:

''ہم آپؐ سے وہ نہیں کہیں گے جو اصحاب موسیٰؑ نے کہا تھا: **اذھب انت و ربک فقاتلا.**

بلکہ ہم آپؐ کے دائیں، آپ کے بائیں، آپ کے سامنے اور آپ کے پیچھے لڑیں گے۔''

اس حدیث کے راوی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ اس جواب سے دمک اٹھا۔(بخاری شریف) حضرت سعد بن معاذؓ انصار کی طرف سے نمائندگی کو اٹھے اور فرمایا:

''اس ذات کی قسم! جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔اگر آپؐ ہمیں لے کر سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں کود جائیں تو ہم آپؐ کے ساتھ کود دیں گے اور ہم میں سے کوئی پیچھے نہیں رہے گا۔ہمیں یہ ہرگز ناگوار نہیں ہے کہ آپؐ کل ہمیں لے کر دشمن سے جا بھڑیں۔

ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے۔مقابلے میں سچی جاں نثاری دکھائیں گے اور بعید نہیں اللہ تعالیٰ آپؐ کو ہم سے وہ کچھ دکھلا دے جسے دیکھ کر آپؐ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔'' (ابن ہشام)

غزوۂ بدر کے واقعات نے یہ ثابت کیا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنے ان دعوؤں میں سچے ثابت ہوئے۔

یہ والہانہ محبت اور سپردگی وجاں نثاری اس محبت کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رفق ومہربانی اور درگزر کی طرف مائل کرتی تھی۔ اصحابؓ کے دل میں آپؐ کے پیغام کو گہرا اتارتی تھی۔ استاد اور شاگرد کے نصب العین میں ہم آہنگی پیدا کرتی تھی۔ بلاشبہ معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس محبت کا حظ وافر عطا ہوا تھا۔

مؤثر نظم وضبط:

تعلیمی زندگی میں نظم وضبط کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ نظم وضبط قائم کرنا استاد کی اولین ذمہ داریوں میں سے ہے اور اس کی مہارت کا امتحان بھی۔ کلاس روم اور ادارے میں اس کی تربیت کے بعد زندگی بھر کے لیے اس کو طلبہ کی عادات میں شامل کر دینا فرد اور معاشرے پر استاد کا احسان ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ تعلیمی میں اس حوالے سے بھی بہترین نمونہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی اپنی کتاب ''انسان کامل،، میں لکھتے ہیں ''کہ ایک دائرہ تو آپ کی غیر رسمی تعلیم کا تھا۔ یہاں ہمہ وقت تعلیم جاری رہتی تھی، چلتے پھرتے، بازاروں، گھروں اور راستوں میں۔ دوسرا دائرہ اہتمام کے ساتھ تدریس کا تھا۔ اس کا اولین مرکز دار ارقم بنا، بعد ازاں دارِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بالآخر مسجد'' (انسانِ کامل) مسجد کے مرکز تعلیم ہونے سے اسلامی تعلیم نئی جہات سے آشنا ہوئی۔ اس پاکیزہ اور مقدس ماحول میں تزکیہ کا رنگ تعلیمی عمل میں رچ بس گیا۔ یہاں چونکہ آدابِ مسجد کے منافی کام ناپسندیدہ تھے، چنانچہ یکسوئی تعلیم وتعلم کی طرف ہی رہتی اور معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس محبت کا حظ وافر عطا ہوا تھا۔ اس مکتب کے طالب علم دنوں میں وہ کچھ سیکھتے جو دوسرے برسوں میں سیکھ پاتے ہیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: ''صحابہ جب صبح نماز پڑھ لیتے تو حلقوں کی صورت میں بیٹھ جاتے۔ قرآن مجید پڑھتے اور فرائض وسنن سیکھتے۔،، (مجمع الزوائد)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ویسے بھی ان کی توجہ علوم نافع سیکھنے کی طرف مبذول کروا رکھی تھی۔ مسجد کے باہر ہی تیراندازی، دوڑ، کشتی وغیرہ کے مقابلے اور مشق کی جاتی تھی۔

اس تعلیمی نظم وضبط نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنے اثرات دکھائے۔ مثلاً جہاد کا میدان اس کی نمایاں مثال ہے۔ قتل وغارت گری اور سلب ونہب مدتوں سے عربوں کا شعار تھا۔ بہت سے قبائل کی معیشت ہی اسی سے وابستہ تھی۔ مدینے آنے کے بعد اور فرضیت جہاد کا حکم آنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ڈسپلن کو معیار بنا کر جہاد اور عام قتل وغارت میں فرق کو واضح فرمایا۔

مقاصد جہاد کے باب میں آپ نے اپنے ساتھیوں کے سوالات کے جواب میں کئی بار صراحت فرمائی کہ مال کے لیے لڑنا جہاد نہیں، شہرت وناموری کے لیے لڑنا بھی نہیں۔ صرف ''من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ'' (ابن ماجہ) ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ جس نے اونٹ باندھنے کی رسی کی نیت بھی رکھی، اس کو (جہاد کا اجر نہیں) وہی شے ملے گی، جس کی اس نے نیت کی تھی۔ (النسائی) قتال اور جنگ کے آداب مقرر فرمائے۔ یہ طے فرما دیا کہ کن کو قتل کیا جا سکتا ہے اور کن کو نہیں۔ فصلوں اور کھیتیوں کو نقصان پہنچانے اور لوٹ مار سے منع فرما دیا۔ ''لوٹ کا مال مردار سے زیادہ حلال نہیں ہے۔'' (ابوداؤد) مال غنیمت کی ایک سوئی بھی اپنے امام کے پاس جمع کروانے کا پابند بنایا۔ (ابوداؤد) عرب اتنی پابندیوں اور بندشوں کے کہاں عادی تھے۔ وہ بھی میدانِ جنگ میں۔ لیکن نبی مہربان کی تعلیم وتلقین، تزکیہ وتربیت کے یہ ثمرات تھے کہ آنے والے سالوں میں مسلمانوں کی اس منظّم سپاہ نے اپنے وقت کی بڑی طاقتوں کی فوجوں کی صفیں الٹ دیں۔

معاشرتی میدان میں جو ڈسپلن آپؐ نے پیدا فرمایا، اس کی روح مساوات تھی۔ قانون، ضابطے اور اصول سب کے لیے یکساں تھے۔ اسامہ بن زیدؓ آپؐ کے محبوب تھے، لیکن حدود کے معاملے میں ان کے سفارش کرنے پر آپؐ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔ فاطمہ مخزومیہ بھی کسی کم مرتبہ خاندان سے نہ تھیں، لیکن آپؐ نے فرمایا کہ فاطمہ بنت محمد بھی ایسا فعل کرتیں تو یہی سزا پاتیں۔ (بخاری شریف) حقوق، فرائض، احکام اور معاہدات واضح اور متعین تھے اور باز پرس ممکن۔ نبیؐ خود اپنے آپ کو بدلے کے لیے پیش کر دیتے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ میں ایسی سینکڑوں مثالیں قائم ہوئیں کہ قضاۃ نے بلاتکلف حکام وقت اور سلاطین کے خلاف فیصلے دیے۔

(جاری ہے)

خاص مضمون

آمنہ نذیر قاضی

خاندان اور ہمارے رویّے

آج اُمت مسلمہ جہاں دیگر مسائل کا شکار ہے وہاں ہمارے خاندانی نظام کو بھی نفرتوں کی بھینٹ چڑھایا جارہا ہے۔صورتحال کی بہتری کے لیے چند گذارشات

انسان مدنی الطبع ہے وہ زندگی گزارنے اور معاملاتِ زندگی کو جلا بخشنے کے لیے رشتوں کا محتاج ہے۔انسان تنہا زندگی نہیں گزارسکتا۔حضرت آدمؑ کی تخلیق ہوئی تو ساتھ ہی اماں حوا کو بھی پیدا کیا گیا،اس طرح مرد وعورت مل کر ایک خاندان کی تشکیل کرتے ہیں جہاں مرد خاندان کو جوڑنے کا باعث ہے وہاں عورت کا کردار بہت اہم ہے بلکہ خاندان کو جوڑنے کا اصل کام ہی عورت کا ہے۔مرد وعورت کا آپس کا تعلق نکاح کے خوبصورت بندھن سے جڑتا ہے۔نکاح جو دوافراد اور دو خاندانوں کے درمیان محبت واُلفت کا ایک عہد ہے خاندان کو باہم ایک کرنے میں نکاح کے الفاظ خود اس کی وضاحت کرتے ہیں:

''لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد وعورت دنیا میں پھیلا دیئے اسی خدا اسے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور رشتے اور قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو یقین جانو اللہ تم پر نگرانی کررہا ہے''۔

(سورۂ نساء، آیت ۱تا۲)

انسان کی تخلیق کے بعد اس کے نظام کی بنیاد خدائی نظام پر رکھی گئی ہے۔انسانوں کو ایک دوسرے سے صلہ رحمی سے جوڑا گیا......ان حقائق کے ساتھ انسانوں کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ رشتوں کا احترام کریں اور انھیں مضبوط بنائیں!

انسان کے اجتماعی نظام اور انسانی معاشرے کی زندگی اس خاندانی حکمت عملی پر رکھی گئی ہے۔اسی پر انسانی معاشرے کی تنظیم بھی ہے۔اس نظریۂ حیات کا مالک صرف اور صرف اللہ رب العالمین ہی ہے۔اب ذرا غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ انسان اپنے بنائے ہوئے رشتوں کو تو نبھانے کے لیے ہزاروں قربانیاں دیتا ہے مگر اللہ کے بنائے ہوئے رشتوں اور ان کے حقوق سے ہر ممکن حد تک پہلو تہی کرتا ہے۔دین اسلام رشتے داروں کے حقوق وفرائض کی ادائیگی کو صلہ رحمی سے وابستہ کرتا ہے اور صلہ رحمی کرنے والوں کو جنت اور لمبی عمر کی بشارت ہے۔اسلام میں مسلمانوں پر قرابت داروں کے درجہ بدرجہ حقوق ہیں۔حقوق وفرائض لازم وملزوم ہیں مگر آج ہر فرد کو صرف حقوق یاد ہیں اور فرائض کو بھلا بیٹھے ہیں۔

قرابت......اقربا سے نکلا ہے۔اقربا کے معنی قریب ترین کے ہیں۔ہمارے اقربا میں پورا خاندان شامل ہے۔ہمارے خاندان میں ننھیال، ددھیال، میکہ سسرال ہیں۔اس تقسیم کے ساتھ پورے خاندانی نظام کی ترویج وکامیابی ہمارے مثبت رویوں پر منحصر ہے۔ننھیال، ددھیال مل کر باہم خاندان بناتے ہیں اور اسلام میں معاشرے کی بنیاد ہمارے خاندان پر ہی ہے۔اگر اس میں توازن ہوگا تو معاشرے میں بھی سکون، خوشگواری اور توازن ہوگا۔مگر اس خاندان کے ساتھ ہمارا رویہ کیا ہے؟؟ خاندان کی جدا جدا حیثیت کو ہم نے ایک کرنے کے بجائے ان میں اپنے رویوں سے صدیوں کی دُوریاں پیدا کردی ہیں۔قرآنِ پاک میں ارشاد ہے: ''اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ الگ سلسلے چلائے''۔(سورۂ نحل)

نَسَبًا وَّصِھْرًا میں دونوں کی حیثیت برابر ہے۔ ان میں کوئی فرق نہیں۔ یہ فرق صرف اور صرف ہمارے اپنے ذہنوں کا پیدا کردہ ہے۔ نسب منسوب سے نکلا ہے۔ منسوب سے مراد کسی خاص چیز، ملک یا رشتے سے منسلک ہونا۔

دوسرا لفظ صِھْرًا ہے۔ اس کے معنی پھیلانے اور قریب و نزدیک کرنے کے ہیں۔ سمجھنے والی بات یہ ہے کہ ایک طرف منسوب کیا جا رہا ہے تو دوسری طرف نزدیک اور قریب کیا جا رہا ہے۔ حماۃ ساس کو کہتے ہیں اور حمو سسر کو کہا جاتا ہے۔ نسب اور صِھْرًا ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایک طرف والد اور ان کی نسبت سے دادا، دادی، پھوپھی، چچا، تایا۔ دوسری طرف والدہ تو ان کی مناسبت سے نانی، نانا، ماموں، خالہ، پھر ان کی اولادیں۔ یہ ایک مکمل خاندان بن جاتا ہے۔ صِھْرًا سے نسب کا سلسلہ چلتا ہے۔ ساس اور سسر بھی اقارب میں شامل ہیں۔ صِھْرًا اور نسب میں برابری کا حکم ہے مگر بدقسمتی سے آج کے معاشرے میں میکہ اور سسرال دو فریق دو مدمقابل گروہ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ اس تفریق کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ میکہ ہمارا بہت اچھا ہوتا ہے اور سسرال میں تمام خرابیاں نظر آتی ہیں۔ اگر ہم ایمان داری کے ساتھ جائزہ لیں تو بڑے فتنوں سے بچا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک لڑکی بیاہ کر سسرال گئی۔ سسرال میں لڑکی کو adjust کرنا ہوگا نہ کہ سسرال کو۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ دوسری طرف لڑکی کو سسرال نے کھلے دل سے قبول کرنا ہے۔ ساس کو ماں بن کر (یہ طے ہے کہ اپنی ماں اپنی ہی ہوگی کوئی دوسرا اس کی جگہ نہیں لے سکتا مگر ساس ماں کی جگہ ہے) اپنے گھر کے طور طریقے پیار و محبت سے سکھانے ہیں۔ نندوں کو خود آگے بڑھ کر بھابی کے لیے جگہ بنانی ہے۔ اسی طرح گھر کے دیگر افراد کو بھی پیار و محبت اور توجہ دینی ہے تو دوسری طرف لڑکی کے آنے سے کئی خدشات بھی جنم لیں گے۔ ماں سے بیٹا نہ چھن جائے، بہنوں سے پیار کرنے والا بھائی جدا نہ ہو جائے، بھائی سے دوست اور ساتھی الگ نہ ہو جائے...... ان تمام رشتوں کی لڑیوں کو مضبوط باندھنا اور مزید خوبصورت بنانا آنے والی لڑکی کا کام ہی ہوگا، ان رشتوں کو جوڑنے میں پُل کا کام اس لڑکی کو ہی ادا کرنا ہے۔

اگر سسرال میں ساس اور سسر نہ ہوں صرف نندیں اور دیور ہوں تو ان بہن بھائیوں کی ذمہ داری کو اُٹھانا بھابی کی ہی ذمہ داری بنتی ہے۔ خونی رشتے اور قرابت کے حوالے سے یہ لازمی بھائی کا کام ہی ہے اور اس ذمہ داری میں بیوی بھی برابر کی شریک ہے جو کہ شریکِ حیات ہے۔ پھر شوہر سے منسوب ہونے کی وجہ سے نسب جڑا تو قرابت کا تعلق خود بخود پیدا ہو گیا۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ''جس شخص نے تین بہنوں یا تین لڑکیوں کی سرپرستی کی انھیں تعلیم و تربیت دی۔ ان کے ساتھ رحم کا سلوک کیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انھیں بے نیاز کر دے تو ایسے شخص پر جنت واجب ہے۔ (ابوداؤد)

رشتے داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آنا قرابت کا حق ہے۔ قریب کے رشتہ داروں میں میکہ اور سسرال دونوں شامل ہیں مگر ہمارے قریب صرف میکہ ہی کیوں ہوتا ہے؟ سسرال پر اعتبار کیوں نہیں کرتے؟ ہوسکتا ہے آپ سوچ رہے ہوں کہ ساری خرابی لڑکی یا میکے میں بتائی جا رہی ہے، خرابی سسرال میں بھی ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے مگر کیا ہم اس فاصلے اور خرابی کو دُور نہیں کر سکتے؟ ہم صرف چھوٹی چھوٹی باتوں پر بدگمان ہو جاتے ہیں۔ اس میں کئی خرابیاں ہیں جنھیں ہم سمجھ نہیں رہے ہوتے، مثلاً ''بدگمانی'' ایسا کیڑا ہے جو دیمک کی طرح اندر ہی اندر تمام رشتے کو کھا جاتا ہے۔

و لا تقف ما لیس لک بہ علم .

''جس چیز کے بارے میں تمھارے پاس یقینی علم نہیں اس کی پیروی مت کرو''۔ (بنی اسرائیل)

''ظنِ سوء'' ایک مفروضہ اور بے بنیاد بات کو لے کر پوری کہانی بنا لینا ہے۔ حدیث کی رُو سے ستر گمان اچھے کرنے کا حکم ہے مگر ہمارا عمل کیسا ہوتا ہے؟ بغیر تحقیق و تصدیق کے اپنے گمان کے محل تعمیر کر لیتے ہیں۔ شیطان دراصل خاندان میں نفرت پیدا کرنے کے لیے اسی راستے کو اختیار کرتا ہے لہٰذا بدگمانی سے بچنا خاندان کو بچانا ہے۔ اکثر ہمارے ہاں اب یہ ہونے لگا ہے کہ شادی ہوئی نہیں اور بدگمانیاں پہلے پیدا کر دی جاتی ہیں۔ میکے میں سسرال کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر تنقید کر کے اور سسرال میں میکے کی غیر اہم باتوں کو اہمیت دی جانے لگتی ہے۔ اگر دونوں طرف سمجھ دارانہ رویہ اختیار کیا جائے تو

بے مثال خاندان تشکیل پائے۔اس کے ساتھ مزید بیماریاں جو ہمارے خاندان کو کاٹنے کا باعث بنتی ہیں۔ان میں حسد، کینہ، بُغض، حرص، غیبت شامل ہیں۔ یہ وہ تمام اخلاقی بیماریاں ہیں جن کو قرآن بڑی شدت سے روکتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ:''جب معاملہ پختہ ہوجائے تو اللہ پر یقین کریں یہ ان کے لیے بہتر ہوگا''۔(۲۱:۴۷)

''تو جو درگزر سے کام لے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے''۔ ہمیں حُسنِ ظن اور حُسنِ سلوک سے کام لے کر درگزر کرنا ہوگا۔ حُسنِ سلوک کی دو قسمیں ہیں: قول اور فعل۔

سسرال میں سسر لڑکی کا ابدی محرم ہے اس لیے اسے باپ کی حیثیت حاصل ہے۔حضرت علیؓ کا قول ہے کہ:''احترام کے لحاظ سے ایک انسان کے دنیا میں تین باپ ہوتے ہیں: ایک اپنا باپ جس نے جنم دیا، ایک استاد جس نے تعلیم و تربیت دی (گو کہ وہ محرم نہیں ہوتا) تیسرا وہ جو بیٹی دیتا ہے''۔

ہمارے ہاں سسرالی رشتوں کو سوتیلا بنایا جاتا ہے حالانکہ آپ کے بچے کا نسب چلتا ہی سسرال سے ہے۔سسر باپ کے درجے پر اور ساس ماں کے درجے پر۔حضرت فاطمہؓ کی ساس فاطمہ بنت اسد کا بیان ہے کہ''جس قدر میری خدمت حضرت فاطمہؓ نے کی ہے شاید ہی کسی بہو نے اپنی ساس کی کی ہو''۔

ہم اپنی جگہ سوچیں کہ کیا ایسی گواہی ہمیں مل سکتی ہے؟ آج رشتوں کو خود ہم نے دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ایک طرف نند دوسری طرف بہن، ماں اور بہن آنکھ کا تارا......ساس اور نند بوجھ......کیا یہ ہمارا دہرا معیار نہیں کہ ہم بھابی ایسی چاہتے ہیں جو ماں کی خدمت کرے مگر جب خود بھابی بنتے ہیں تو معیار تبدیل ہو جاتا ہے، یہ تضاد کیوں؟

ان بدگمانیوں میں مبتلا ہو کر ہم نکاح کے اصل مقصد یعنی اولاد کی تربیت اور اس کے مستقبل سے لاپرواہ ہوتے چلے جاتے ہیں، اپنی ہی اولاد کو حقیقی رشتوں سے دُور کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ایسی گھمبیر صورت حال ہے کہ آپ کی اولاد اپنے سگے رشتوں کے نام سے بھی نفرت کرنے لگتی ہے۔ دادا، دادی، پھوپھی، چچا، تایا نفرت کی علامت بن جاتے ہیں۔ادب و احترام کے رشتے بھی ختم ہونے لگتے ہیں۔اپنی اولاد ہی کو کنفیوز شخصیت بنا دیا کیا یہ ان پر ظلم نہیں؟

قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ:''وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمہیں بیٹے اور پوتے عطا کیے''۔(النحل)

اولاد کی تربیت اصل ذمہ داری ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیت میں بھی وضاحت ہے کہ بیٹے اور پوتے عطا کیے گویا آپ کی اولاد کی تربیت کی ذمہ داری آپ کے ساتھ آپ کے سسرال کی بھی ہے کیونکہ نسل انھی کی ہے۔خون کا رشتہ انھی سے ہے لیکن اگر ان رشتوں میں دُوریاں پیدا کر دیں گے تو یقیناً آپ کی اولاد ایک مکمل اور کامیاب شخصیت نہیں بن سکے گی اور اس عمل کا لازمی نتیجہ پچھتاوا ہے۔اگر آج اپنی اولاد کو ان رشتوں سے متنفر کریں گے تو کل کوئی آپ سے اپنی اولاد کو دُور کر دے گا۔ یقین کریں ان رشتوں کی نفرت اور دُوری آپ کبھی سہار نہیں پائیں گے، بہت تکلیف دیتا ہے سگے رشتوں کا دُور ہوجانا، اللہ نہ کرے کہیں ایسا ہو کہ:''اور تمھاری حالت اس عورت کی سی نہ ہوجائے جس نے آپ ہی محنت سے سوت کاتا اور پھر آپ ہی اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا''۔(النحل)

ایک مسلمان عورت اپنی اولاد کی تربیت کی ذمہ داریوں کو سمجھنے والی ہوتی ہے۔ جہاں وہ اپنی اولاد کو اپنے رب کے قریب کرتی ہے وہاں رشتوں کی مضبوطی اور پائیدار ڈوریوں میں بھی باندھتی ہے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اپنی اولاد کو ہر معاملے میں مثبت سوچ دیں۔مسائل ہر جگہ ہوتے ہیں کیونکہ ہمیں پیدا کرنے والے نے کہہ دیا کہ''مومن تو آزمائے جائیں گے''۔

ان آزمائشوں سے ڈریں نہیں، صرف صبر اور ایمان بطور ہتھیار اس دشمن ازلی کے مقابلے پر اُٹھالیں کیونکہ وہ ہمارے خاندانی نظام کو بکھیرنا چاہتا ہے۔بس آپ ایک کام کریں ''اپنا باس بدل دیں''۔

میں نے یہ جملہ کہیں پڑھا بہت اچھا لگا۔حقیقت یہی ہے کہ اپنا باس بدل دیں۔یعنی بندوں کو خوش کرنے کے بجائے رب کو خوش کرنے کی فکر کریں تو تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔پھر آپ خود محسوس کریں گے کہ کیسے ہر طرف سکون واطمینان ہے، خاندان کیسے یکجا ہو گیا! پھر کوئی تنگی تنگی نہ لگے گی، کوئی پریشانی مایوس نہ کرے گی۔

آج اُمت مسلمہ جہاں دیگر مسائل کا شکار ہے وہاں ہمارے خاندانی نظام کو بھی نفرتوں کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔آج مغرب کا ایجنڈا ہے کہ اُمت مسلمہ کے خاندان کا شیرازہ بکھیر دیا جائے۔خدارا آپ اس کے آگے ڈھال بن جائیے۔آج کا میڈیا جہاں انفرادی حقوق کا شوشہ چھوڑ کر ہمیں تنہا کرنا چاہتا ہے تو دوسری طرف مقدس ومحترم رشتوں میں شک پیدا کر کے نفرت اور مفاد کے بیج بو رہا ہے تاکہ ہماری نوجوان نسل اپنے سگے رشتوں کی محبت اور احترام کو اپنے ہاتھوں کھو دے۔آج مغرب مسلم معاشرے کو مغربی معاشرہ بنانے کی سرتوڑ کوششیں کر رہا ہے مگر اس کے آگے بند ہم نے باندھنا ہے۔ایک مسلمان ماں کی گود سے مادر پدر آزاد نسل نہیں نکلتی۔

امام ابوحنیفہؒ جنھوں نے ۱۲لاکھ فتاویٰ دیئے۔اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ نے خاندانوں کے حصار میں پرورش پائی۔ماں کی گود سے صرف محبت ملی، زبان سے ذکر الٰہی سنا،عمل سے صرف خدمت دیکھی۔حضرت علیؓ نے علم وحکمت اور مکارمِ اخلاق اپنی والدہ فاطمہ بنت اسد کے حکمت سے بھر پور سینے سے حاصل کیے۔عبداللہ بن جعفرؓ عرب کے سخیوں کے سرخیل تھے، عرب کے جوانوں میں بلند مقام رکھتے تھے۔ان کی پرورش اسماءؓ بنت عمیس نے کی اور وہ خود بھی مسلمان خواتین میں بلند مرتبت تھیں۔عمرؒ بن عبدالعزیزؒ نے اس ماں کی گود میں پرورش پائی جس نے اس ماں سے تربیت حاصل کی جس نے اپنے رب کو پالیا تھا۔عمرؓ بن خطاب کی پوتی کی گود آپ کو ملی۔

ہمیں بھی چاہیے کہ اپنی اولاد میں یہ صفات پیدا کریں۔محبت واُلفت، صبر وبرداشت، حُسنِ ظن، مساوات، عدل، خیر خواہی، انکسار، رب کی قربت ومحبت......گھرانے باہم مل جل کر رہنے سے اللہ کی برکت سے فیضیاب ہو جائیں گے کیونکہ تنہا زندگی بسر کرنا انسان کے اختیار سے باہر ہے وہ مجبور ہے کہ ایک خاندان کے ساتھ منسلک ہو کر رہے۔زندگی آسان اور سہل ہو جائے گی کیونکہ انسان تنہا رہ کر سکون کی زندگی نہیں جی سکتے۔

☆☆☆

ہائے یہ رات

کتنی پرکیف ہے مدہوش ہے مخمور ہے رات
کتنی سادہ ہے طرب خیز ہے پرنور ہے رات
جگمگاتا ہوا مہتاب یہ تاروں کا ہجوم
جیسے افسانۂ ماضی کوئی کردے منظوم
نیند ہی نیند ہے چھائی ہوئی گلزاروں میں
خواب ہی خواب ہے کلیوں میں چمن زاروں میں
نالۂ غم ہے جو یوں دل پہ اثر کرتا ہے؟
چاندنی رات ہے یا سحر کوئی کرتا ہے؟

لیکن اس چاندنی شب میں میرے ہمدم مجھ کو
جانے دکھلاتا ہے یہ میرا تخیل کیا کیا

ہاں تصور ہی تصور میں لیے جاتا ہے
جنگلوں میں کبھی دریاؤں میں ویرانوں میں
وادیٔ نیل میں فرعون کے ایوانوں میں
ہاں جہاں آج بھی اخوان ہیں زندانوں میں
ہاں وہی مصر جو موسیٰ کا وطن تھا ہمدم
وہاں وہی مصر جہاں مغربی آقاؤں نے
وادیٔ سینا میں مشرق کو دیا ہے چیلنج

ہائے یہ چاند چھلکتا ہوا ساغر ہمدم
ہائے یہ رات تو آدھی سے زیادہ ہے ابھی

کوند کر برق گری، شعلہ اٹھا، کون جلا؟
دنیا تاریک ہوئی کیسا دھواں دھار ہوا
لوگ کہتے ہیں کہ کشمیر پہ پھر وار ہوا

کوئی جاگا، کوئی اٹھا، کوئی بیدار ہوا؟
ہائے یہ رات تو آدھی سے زیادہ ہے ابھی
آہ کشمیر وہ رنگوں کا شگوفوں کا جہاں
آہ وہ رنگ کا وہ نور کا فردوسِ جواں
بھارتی تیغِ ستم پھر کسی گردن پہ چلی
وہ کسی آنکھ سے گرنے لگی موتی کی لڑی
کہیں چیخی کوئی بیوہ کہیں بچہ رویا
آہ کشمیر تجھے ہاتھ سے کس نے کھویا
ہائے یہ رات تو کٹتی نہیں کٹتی ہی نہیں
جیسے انگارے ہیں یہ چاند ستارے ہی نہیں
دور گھڑیال نے وہ تین بجائے تو کہیں
یہ چمکتا ہوا مہتاب یہ روشن تارے
دو گھڑی کے لئے ہیں اور یہ مہماں سارے
پھول سو جائیں گے شبنم بھی ڈھلک جائے گی
چاند ڈھل جائے گا یہ رات گزر جائے گی
ہائے یہ رات یہ پر کیف وحسیں چاندنی رات
اپنے ماحول میں بے کیف ہے بدصورت ہے

(بنت مجتبیٰ میناؔ)

غزل

حال پہ میرے ہنسنے والے شاید کہ دیوانے ہیں
یا پھر غم کی چوٹ سے اب تک دل ان کے بیگانے ہیں

پیشانی پہ صبح سجی ہے دل میں گھور اندھیرا ہے
لاکھوں دھوکے کھاکے آخر کچھ چہرے پہچانے ہیں

رنگ دے جب وہ شوخ مداری کھیل کو کچے رنگوں سے
روتے روتے ہنس پڑتے ہیں ، ہم بھی خوب سیانے ہیں

ڈھونڈتے رہتے ہیں گنجینے ہاتھ کی چند لکیروں میں
راہ طلب میں دریا صحرا کب ہم نے سب چھانے ہیں

پڑھتا ہے اب کون صحیفے سنتاہے اب کون اذاں
اپنی اپنی میزانیں ، اپنے اپنے پیمانے ہیں

ساغرِ گل سے ہاتھ اٹھاؤ ، بلبل کو آزاد کرو
دل والو! ان سب کے سوا بھی اورکئی افسانے ہیں

(نجمہ یاسمین یوسف)

غزل

محبت کا محل مسمار کرنا
بہت مشکل ہے دِل پہ وار کرنا

اگر نفرت کی دیواریں گراؤ
مجھے بھی تم شریکِ کار کرنا

جو ممکن ہو تو دریائے محبت
بدن کشتی بنا کر پار کرنا

یہاں پر دوسری باری نہیں ہے
جو کرنا ہو وہ پہلی بار کرنا

میں سچائی سرِ بازار کہہ لوں
خوشی سے پھر سپردِ دار کرنا

چھپایا خونِ ناحق کو ہے کس نے
عدالت یہ سرِ بازار کرنا

کرامتؔ ہو سکے تو زندگی بھر
ہمیشہ زندگی سے پیار کرنا

(کرامت بخاری)

اے ظالم دریا بول ذرا!

نصر اللہ شجیع اور سفیان عاصم کے حوالے سے دریا کنہار سے شکوہ

رفعت محمود صبا

اے کنہار! اے ظالم دریا
کیا تجھ کو احساس بھی ہے
تم نے دو ماؤں سے ان کے
شہزادوں کو چھینا ہے
خوش خوش چھوڑ کے ماؤں کو
وہ سیر کی خاطر آئے تھے
رہنا تھا کچھ روز انہیں
سامان خوشی کا لائے تھے
وہ صبح تو روشن تھی بہت
پر اس میں اجل اندھیرے تھے
وہ غرق تری لہروں میں ہوئے
مہمان جو کل سے تیرے تھے
کیا مہمانوں کے ساتھ کوئی
اس طرح دغا بھی کرتا ہے
اور ماؤں سے بیٹوں کو بھلا
اس طرح جدا بھی کرتا ہے
کیا تجھ کو ترس نہ آیا کچھ
کہ بچے ہیں یہ ماؤں کے

ور مائیں اپنے بچوں کو
اپنے دل کے ٹکڑوں کو
جب لینے یاں پہ آئیں گی
کیا منہ ان کو دکھلاؤ گے؟
کیا ان سے کہو گے؟
اے دریا! کیوں تم نے ان کے بچوں کا
لہروں سے اپنی قتل کیا
ان غم کی ماری ماؤں کے
جب آنسو تجھ پہ برسیں گے
اور کرچی کرچی دل ان کے
بیٹوں کے پیار کو تڑپیں گے
تو بولو اے ظالم دریا!
کیا منہ ان کو دکھلاؤ گے
پھر کیا تم تھم نہ جاؤ گے؟
کیا یوں ہی بہتے جاؤ گے؟
تم کیسے بہتے جاؤ گے؟
تم کیسے بہتے جاؤ گے؟

☆☆☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

وہ دل، وہ دِیا

نانی اماں جی کے پہلو میں لیٹ کر پاکستان بننے کی کہانی اور سفر ہجرت کی داستان سننا ننھی کے بچپن کا وہ ان مٹ نقش ہے جو کبھی مدھم نہ ہو سکا۔

گرمیوں میں گھر کی چھت پہ رات کو کھلے آسمان خوبصورت جگمگ کرتے تاروں کی چھاؤں کا ساتھ ہو، بدلتے موسم کے رنگ ہوں، برسات کے پکوان کی خوشبو ہو...... یا پھر سخت سردی میں ٹھٹھرتے ہاتھ پاؤں لے کر اماں جی کے ساتھ انگیٹھی پہ ہاتھ تاپتے ہوئے گرمائش کا احساس...... یا جاڑے کے سناٹے میں رات کو گلی سے کتے کے بھونکنے اور بلی کے رونے کی آواز سے خوفزدہ ہونا اور لحاف میں گھس کر اماں جی کے سینے میں منہ چھپا کر کانپتے دل پہ قابو پانے کا مرحلہ، ہر حال میں کسی نہ کسی طور ہجرت کا ذکر آ ہی جاتا...... ننھی کو محسوس ہوتا، ہر موسم، ہر کیفیت کے ساتھ سفر ہجرت کا احساس جڑا ہوا ہے...... ٹرین کا لمبا سفر ہوتا، یا گاؤں جانے کے لیے ٹانگے میں بیٹھنا ہوتا...... گاؤں کے کھیت ہوتے یا کچے گھر، پکی گلیاں ہوتیں یا پکے گھر، داستان ہجرت کا کوئی نہ کوئی پہلو کھٹ سے اپنے پٹ کھول دیتا...... ننھی، اماں جی اور پاکستان...... ایک ایسی تکون تھی جس کو آج بھی کوئی نہیں توڑ سکا۔

بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اماں جی، بیتے دنوں کو یاد کرتی جاتیں اور جانے کب ننھی کی آنکھ لگ جاتی اور قصے کا کوئی حصہ ادھورا رہ جاتا۔ چند سال کی ننھی کہانیاں سننے کی شوقین تھی۔ کہانی کی نہ بُنت سمجھ آتی، نہ شروع کے مناظر یاد تھے نہ ہی انجام تک آنکھیں انتظار کرنا جانتی تھیں۔ اسکول جانے کی عمر سے پہلے چند ناموں اور لفظوں کی تکرار اس کے ذہن میں رہ جاتی۔

دارالاسلام، روڑی، سرسہ، بابا جی، سفر کی تھکاوٹ، پیاس اور خوف۔ بیماری اور موت ان سب کے ساتھ ایک لفظ ''پاکستان'' کی تکرار۔

دو چار سال بعد لفظوں اور جملوں کی ترتیب اور واقعات کا سرا ننھی کے منے سے ذہن میں سمانے لگا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے پٹھان کوٹ میں ''دارالاسلام'' کے نام سے ایک بستی بنائی تھی۔ اس کی طرز پر حکیم عبداللہؒ، چوہدری نذیر احمدؒ نے دوسرے ساتھیوں، نوجوان لڑکوں کے ساتھ مل کر سرسہ شہر سے باہر ایک بستی ''دارالاسلام'' کے نام سے آباد کی تھی...... سرسہ شہر کے قریب ایک گاؤں ''روڑی'' میں اماں جی اور سب لوگ رہتے تھے۔ دارالاسلام میں مسجد، مدرسہ تھا اور اسلام سے محبت کرنے والے گھرانے بچوں کو یہاں پڑھنے بھیجتے اور آہستہ آہستہ وہاں آباد ہو رہے تھے۔ ہم اس مثالی بستی کو چھوڑ کر مثالی ملک بنانے نکلے تھے۔ اب ننھی اس قابل ہوگئی تھی کہ سمجھ نہ آنے والی بات پہ سوال کر سکے۔ اور کچھ معلومات میں اضافہ اور کہانی کی ترتیب کو سنبھال سکے۔

''اماں جی! ہندو کیسے ہوتے ہیں؟'' ننھی کے ذہن میں ہندو کے نام سے انسان کا تصور نہ بندھ رہا تھا۔

اماں جی کے چہرے پہ مسکان سی آئی۔

''ہوتے تو انسان ہی ہیں۔ مگر ان کے سر پر چوٹی ہوتی ہے بالوں کی...... اور وہ بتوں کو پوجتے ہیں، اللہ کو نہیں مانتے، مسلمانوں کو ملیچھ سمجھتے ہیں۔''

''ریچھ؟'' ننھی کی حیرت سے پھٹی آنکھیں دیکھ کر اماں جی کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''ملیچھ'' یعنی ''ناپاک''۔ وہ اپنے گھروں میں مسلمانوں کو نہیں آنے دیتے۔ ان کے برتن کو مسلمان چھو لے تو اس کو پاک کرتے ہیں۔ ان کا جوٹھا پانی نہیں پیتے۔

اماں جی کے لہجے میں گہری اداسی اور آواز میں نقاہت سی آجاتی۔ ننھی کو یہ سب کچھ سمجھ نہ آتا...... مگر سر پر بالوں کی ایک لمبی سی چوٹی والا ہندو اسے ڈرانے کو کافی تھا۔

اماں جی جب کبھی شہر سے باہر کسی بیٹے کے پاس جاتیں تو ننھی ان کی ہم سفر ہوتی۔ رحیم یار خاں، بہاول پور جانا ہوتا تو نانی اور ننھی کا ساتھ نہ چھوٹتا اور اس سے بھی پہلے جب وہاڑی میں ان کے چھوٹے بیٹے کی سکول میں ملازمت تھی۔ ننھی سکول کی ابتدائی کلاسوں میں تھی۔ ان دنوں چھٹیاں تھیں۔ سالانہ امتحان ہو چکے تھے۔ بہار کا موسم تھا۔ رم جھم سی ہوتی رہتی۔ ٹھنڈی ہوائیں...... چھوٹا سا گھر...... چھوٹے ماموں، اماں جی اور ننھی کا ساتھ خوب تھا۔

دودھ جلیبیاں، چوری، گرم گرم تازہ دودھ...... اور کہانیاں پڑھنے کو روز ننھے بچوں کی نئی کتابیں...... جو چھوٹے ماموں اسکول کی لائبریری سے روزانہ لاتے...... اماں جی اور ننھی کی تو روز عید تھی دونوں مطالعہ کی شوقین فیروزسنز کی ساری کتابیں دنوں میں ختم ہو گئیں جو وہ پڑھ سکتی تھی۔

''ننھی! وہاڑی اور روڑی دونوں ملتے جلتے ہیں نا!''

''جی! آپ کو یاد آ رہا ہے اپنا گاؤں؟''

''یاد تو آتا ہے...... مگر اب تو اپنا پاکستان ہے نا! تمھیں پتہ ہے پاکستان کے معنی ہیں پاک جگہ یا پاک رہنے والوں کی جگہ''

اور پھر سفر ہجرت، ہجرت کی اہمیت اور اس کے نتیجے میں ملنے والے ثواب پہ خوش ہوتی رہیں۔

ایک دن ننھی نے سوال کیا۔

''اماں جی! کیا آپ کو پتہ تھا کہ اگر پاکستان بنا تو اس طرح مسلمانوں کو قتل کیا جائے گا؟''

''نہیں، سرسہ۔ ہمارے گاؤں کے ساتھ شہر تھا۔ اور اردگرد کے سارے لوگ بابا جی (مولانا محمد سلیمانؒ) کی بہت عزت کرتے تھے۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی غمی خوشی میں شریک ہوتے تھے۔''

''کیسے شریک ہوتے تھے؟ جب ہندو مسلمانوں کو اپنے قریب بھی نہیں آنے دیتے تھے......'' ننھی کی آنکھوں میں بے یقینی سی تھی۔

''ہندو کو جب اپنا فائدہ نظر آتا ہے نا تو وہ گدھے کو بھی باپ بنا لیتا ہے۔'' چھوٹے ماموں نے جواب دیا جو ساتھ ہی بیٹھے تھے۔

''کیا فائدہ تھا اس کو؟ پہلے مل جل کر رہنے میں؟'' ننھی کو اب سوال بہت کرنے آ گئے تھے۔

''ان کو پتہ تھا کہ اگر انھوں نے مسلمانوں کو تکلیف دی تو ان کا برا حشر ہو گا۔ ہندو جو ہے نا! وہ بزدل بھی ہوتا ہے!!''

''تو ان کے لیے تو اچھا ہی تھا نا! کہ مسلمان علیحدہ رہیں، وہ علیحدہ۔ دونوں کو ایک دوسرے کا ڈر نہ ہو...... ان کو کیا تکلیف تھی مسلمانوں کا ملک بننے سے؟'' ننھی سخت مشتعل تھی۔

''وہاں کے ہندو دراصل انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوستان پہ حکمرانی کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے اور مسلمانوں کو غلام بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔''

چھوٹے ماموں اس وقت بالکل ماسٹر صاحب لگ رہے تھے...... ننھی نے اکتائے سے لہجے میں بے زاری کا اظہار کیا اور منہ سر لپیٹ کر بستر میں لیٹ گئی...... رات بھر مچھر کاٹتے رہے اور اگر نیند آتی تو ہندو کی چوٹی زور زور سے ادھر ادھر ہلتی نظر آتی جب ہندو بندر کی طرح چھلانگیں لگاتا دیواریں پھلانگتا، مارنے آ رہا ہوتا...... خوف سے ننھی کا دل دھک دھک کرنے لگتا...... اسی خوف کی حالت میں ننھی، اماں جی سے جا کر لپٹ گئی۔

''کیا ہوا؟''

''اماں جی، ہندو آ جائے گا......ڈر لگ رہا ہے۔''

''دکملی نہ ہو تو...... یہ پاکستان ہے یہاں کوئی ہندو تمھیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' اماں جی نے ننھی پہ آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی۔

جب ۶۵ء کی جنگ لگی تو اماں جی کی حالت دیدنی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے فتح کی دعائیں مانگا کرتیں، اور ننھی کو ہر روز پاکستان کی طرف ہجرت کے روح فرسا واقعات سننے کو ملتے۔ ننھی کا یقین پختہ ہوتا جاتا کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔

''ایسے ہی مفت میں نہیں بن گیا پاکستان، خون کا سمندر دیکھا ہے ہم نے، کتنے شیر جوان قربان کیے ہیں......اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے یہ جگہ دی ہے۔ مدینہ بنانے کے لیے......لوگو، قدر کرو، قدر کرو۔''

ہر آتے جاتے فرد کے پاس بیٹھ کر دہائی سی دیتی اماں جی۔ جنگی ترانے سنتیں، فوجی جوانوں کے پیغامات سنتیں اور ہونٹ ہل رہے ہوتے دعا کے ساتھ۔

خبریں لازماً سنتیں......روزانہ سورۂ فتح کی تلاوت کرتیں۔ ''نصر من اللہ و فتح قریب'' قرآن پڑھنے والی شاگرد لڑکیوں کو یاد کروادی تھی...... کسی کو فضول باتیں کرنے کی اجازت نہ تھی......زبان ہلانی ہی ہے تو فتح کی دعا مانگو۔

ننھی نے جان لیا کہ پاکستان سے تعلق، لگاؤ، اس کی فکر اور اس سے محبت اس لیے ہے کہ اس کی بنیادوں میں ایمان، یقین، مدینہ کی بو باس رچ گئی ہے...... یہ اسلام کا قلعہ ہے، اس سے محبت ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔

''اماں جی! آج شروع سے ساری کہانی سنا دیں ہجرت کی۔'' ننھی کے لیے اب بہت کچھ سمجھنا آسان ہو گیا تھا......مگر اماں جی کے لہجہ میں یاسیت سی آتی جا رہی تھی۔

''پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ......کیا تمھیں لگتا ہے کہ یہ مطلب واضح ہو رہا ہے۔ پاکستان میں؟'' الٹا اماں جی نے سوال کر دیا۔

پھر خود ہی تھکی تھکی سی کہنے لگیں۔

''ملاوٹ والی چیزیں مل رہی ہیں......آنکھوں میں حیا ختم ہوتی جا رہی ہے......'' ننھی کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

جب ۷۰ء کے الیکشن ہوئے تو بھی پاکستان کو پاکستان بنانے کی دہائی دیتی رہیں۔ ننھی نے جان لیا تھا کہ اماں جی کو اپنے پاکستان کو بنانے میں جو کچھ قربان کرنا پڑا۔ اس کی یاد تازہ کرتے رہنا ایک خوراک ہے جو کسی کمزور ہوتے انسان کو دیے جانا ضروری ہوتا ہے۔

''اماں جی! آپ کو کتنے دن لگے تھے سرسہ شہر سے پاکستان کی سرحد تک پہنچنے میں؟'' ننھی نے آغاز کر دیا......۔

''پندرہ دن لگے......چھوٹے بچے، بیمار لوگ، کھانے کی قلت...... پینے کے لیے نہر کا گدلا پانی، گاؤں والے گھر سے نکلنے کے بعد دو عیدیں ہم نے مہاجرت و مسافرت میں منائیں......جب کچھ ٹھکانہ میسر آیا تو ہیضے کی وبا آئی......گنتی کے چند دنوں میں گھر سے کئی جنازے اٹھے۔''

دونوں کی آنکھوں میں نمکین پانی تیرنے لگا۔ ننھی نے یہ سب جنازے نہ دیکھے تھے مگر اماں جی کی آنکھوں کے چراغ مدھم ہونے لگتے۔ ٹھنڈی سانسیں بھرتیں۔ انا للہ پڑھتیں اور صبر کے بہترین اجر کے یقین سے پرسکون سی ہو جاتیں۔

''اماں جی! آپ کے خیال میں پاکستان، ''پاکستان'' کیوں نہیں بنا اب تک؟'' ننھی کو اس دن بہت بے تابی تھی۔ اماں جی کے منہ سے جواب سننے کی۔

پاکستان رمضان المبارک کی ۲۷ تاریخ کو دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ یہ ۱۴/اگست کو کیوں بنا دیا قومی دن؟

دیکھو، اگر ۲۷ رمضان المبارک کو آزادی کا دن مناتے تو اس رات ہر سال کتنی دعائیں، عبادتیں ہوتیں......اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوتا، لوگوں کو

ہدایت ملتی۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں اماں جی...... ننھی کو یہ بات اچھی طرح سمجھ آ گئی......

ننھی اور اماں جی کے درمیان پاکستان کی طرف ہجرت کے بارے میں آخری لمبی گفتگو ان دنوں ہوئی جب ۷۰ء کے الیکشن کے نتائج نے سب کو پژمردگی کے حصار میں جکڑ رکھا تھا۔

''ننھی! تم اچھی طرح روؤ...... یہ رونے کا ہی مقام ہے۔ ایسے حالات میں نہ روئیں تو پھر کس پہ روئیں گے؟''

''یہ پاکستان نہیں ہے۔ لوگوں نے اسے ناپاک ستان بنا دیا ہے، کتنی مہنگائی ہے۔ کتنی بے حیائی بڑھ گئی ہے۔ بے ایمان لوگ ہیں۔ بے غیرت و بے حیا۔''

اماں جی کو بے حیائی بڑھ جانے کا غم ستائے رکھتا تھا...... جب حیا نہ رہے تو پھر ہر برائی آتی جاتی ہے۔ بغیر کسی رکاوٹ کے۔

''کیا ہم نے ایک لمبا سفر اور مشقت اس لیے برداشت کی تھی کہ اپنے وعدوں سے منکر ہو جائیں۔ مال، جان، گھر بار، اسباب، عزت آبرو لٹا کر یہ منزل پا رہی ہے قوم؟''

ننھی کے پاس کیا جواب تھا بھلا؟

''کئی روز بھوکے پیاسے پیدل چل چل کر جب قافلہ بیکانیر میں داخل ہوا تو وہاں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان کی سرحد میں داخل ہونے کے لیے...... صحرا میں پڑے رہے بے یار و مددگار...... لگتا تھا منزل چند قدم دور ہے مگر پہنچنا مشکل ہے۔ سارا قافلہ بیکانیر کے صحرا میں اپنی موت دیکھ رہا تھا...... وہ اللہ ہی ہے جو مشکلات میں آسانی پیدا کرتا ہے۔ سب کو پتہ ہے کہ پوری پوری ٹرین کے مسافروں کے ٹکڑے ہی پہنچے پاکستان میں۔ یہ ہے اس کی بنیادوں میں ڈالا جانے والا مسالہ...... کیا اس کی بنیادیں ہم نے کمزور بنائی ہیں؟''

اماں جی اب خود بھی تھک سی گئی تھیں...... ماہ و سال نے ان کے وجود کو بھی کھوکھلا سا کر دیا تھا۔

۷۱ء کی جنگ میں اماں جی نے کیا محسوس کیا اور کیا ہوا ننھی اس سے بے خبر رہی کہ وہ حصولِ تعلیم کی وجہ سے ان سے دور تھی۔ البتہ جس دن اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں ہوئی وہ خاصی خوش تھیں۔ ریڈیو پر براہ راست اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی آمد و استقبال کا حال سنتی رہیں۔ اور ننھی بھی اس خوشی میں شریک رہی۔ معمر قذافی کی تقریر کا ترجمہ ساتھ ساتھ ہو رہا تھا۔ جوش، ولولے، امید نے ننھی اور اماں جی کو شاد سا کر دیا مگر جب بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان ہوا اور اخبار میں خبریں آئیں تو پھر ننھی اماں جی کی گود میں سر رکھے روتی رہی...... اور کمزور بوڑھا سا ہاتھ سر پہ دھرا رہا جس میں جان نہیں تھی۔

شاہ فیصل کی شہادت پہ ننھی اور اماں جی نے کوئی خاص تبصرہ نہ کیا۔ مگر دکھ اور صدمہ کی وہ کیفیت جو اندھیرا بڑھ جانے اور روشنی کی امید نظر نہ آنے پہ ہوتی ہے وہ بغیر کہے سمجھ آ رہی تھی۔

کچھ ہی دنوں بعد ننھی رخصت ہو کر پیا کے ساتھ پردیس چلی گئی...... آج اماں جی کو دنیا سے رخصت ہوئے ربع صدی سے زیادہ ہو گیا ہے۔ ننھی بھی نانی اور دادی بن گئی...... پاکستان کیسا چاہا تھا...... کیا بن گیا۔ ہندو تہذیب ہر گھر میں ڈیرہ جما رہی ہے۔ نظریۂ پاکستان کی نفی کی جا رہی ہے۔

غریب عوام غریب تر ہوتے جا رہے ہیں اور اس کے امیر حکمران امیر ترین ہوتے جا رہے ہیں...... پاکستان بنانے والے رخصت ہوتے جا رہے ہیں اور ہجرت کی داستان سننے والے بھی ان کے پیچھے جانے کو تیار ہیں۔ نئے پاکستان کا بہت غُل ہے۔ اب پاکستان، پاکستان بنے گا؟ وہ خواب کب پورا ہوگا؟

وہ خواب، گل رنگ خواب

جس کی تعبیرِ تمنا میں آنکھیں کھلی ہی رہیں
وہ روشنی،
جس کی ضو کے لیے میں نے زندگی تج دی
وہ منزل
جس کے لیے میں نے قدموں کو آشنائے صعوبت کیا
وہ قلبِ حزیں
جو تکمیلِ تمنا کی آرزو میں نیم بسمل رہا
ہاں وہ خواب، گل رنگ خواب
خوشبو، مہک، تازگی، زندگی
روشنی، چاندسی روشنی
ضیاء، نور، آشتی، آگہی!
کہاں کھوگئی؟
وہ راستہ، سیدھا راستہ
علم وعمل، وہ جذبۂ جاں فزا
کہاں رہ گیا؟
وہ دل، وہ دیا...... کہاں بجھ گیا؟
آؤ، آج ہم تم سبھی
ہاں مل کر ابھی،
اس بجھتے دیئے کو شمع سوز و دروں سے
روشن کریں
ہم دیئے سے دیئے کو جلاتے چلیں

☆......☆......☆

قانتہ رابعہ

طوق

''بس شازیہ بی بی اب میں آخری رشتہ لے کر آئی ہوں اور ایسا زبردست کہ کوئی خامی یا کمی نہ ڈھونڈ پائیں گی.....'' ہانپتے کانپتے امیراں بیگم نے شازیہ دین محمد کو مخاطب کیا اور پانی کا گلاس پی کر پھر سلسلۂ کلام جاری کیا.....''اِس دفعہ تو مانو آپ بغیر دیکھے ہی ہاں کر دیں گی.....''

شازیہ خاموش رہی.....امیراں بیگم نے پھر لقمہ دیا۔

''یہ تیرھواں رشتہ تو میں منظور کروا کے ہی جاؤں گی.....خدا کا غضب بارہ رشتے آپ نے رد کیے آج تک کسی بندہ بشر کی جرأت نہیں ہوئی کہ میرا لایا پہلا رشتہ رد کر سکے ایک تم ہو، مس اعتراض خانم..... پہلا رد کیا لڑکا قد بت کا اچھا نہیں۔لڑکی کا قد بڑا ہے، دوسرا رشتہ مسترد کیا کہ نوکری تو اچھی ہے پر کیا فائدہ زمینیں نہیں ہیں۔تیسرا رد کیا زمینیں اور قد کاٹھ کا تو اچھا ہے تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔اکلوتا بھائی تو ہر وقت سولی پر چڑھا رہتا ہے.....اور بہنیں ہی شریکنیں بن جاتی ہیں، چوتھا آپ نے.....''

''افوہ آج بتاؤ کون سا ہیرا ڈھونڈ کے لائی ہو؟'' شازیہ نے بالآخر لب کشائی کی۔

''ارے ہیرا سا ہیرا.....اللہ بخشے تمھاری ماں سے میری دلی محبت نہ ہوتی تو میں یہ رشتہ کسی اور کے ہی لے جاتی .....شکل کا ایسا کہ دیکھو تو دیکھتے رہ جاؤ..... کیا بانکا سجیلا گھبرو ہے۔ جٹ ساجٹ ہے کوئی۔ زمینیں اتنی کہ آپ پیدل چلو تو پاؤں میں چلتے چلتے چھالے پڑ جائیں۔نوکری اتنی اچھی کہ سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ کالجوں اور اکیڈمیوں میں بھی پڑھاتا ہے۔اور سب سے بڑی بات یہ کہ رہتا بھی شہر میں ہے......''

''ک.....کیا'' حیرت سے شازیہ نے پوچھا۔''یہ سب صحیح ہے؟''

''تو اور کیا.....؟'' امیرن سخت برا مان گئی۔''ہے بھی تمھاری ذات برادری کا..... سچ پوچھو تو شرافت امانت سب کچھ ہی ہے..... میں تو اس کی تصویر تک ساتھ لے آئی ہوں.....'' مارے شوق کے جھٹ پٹ انھوں نے اپنے بٹوے سے تصویر بھی دکھادی.....شازیہ نے اچٹ کر تصویر ہاتھ میں لی.....لڑکا واقعی شکل کا اچھا تھا..... پچھلا رشتہ رد کرنے کی واحد وجہ ہی یہ تھی کہ لڑکے کی رنگت الٹے توے جیسی تھی۔

''رہتے کہاں ہیں؟'' دلچسپی لیتے ہوئے شازیہ نے پوچھا۔

''ملتان میں.....نیو ملتان، بلاک زیڈ.....اپنی کوٹھی کا رسب کچھ ہے۔'' امیرن نے جواب دیا۔

شازیہ کو لڑکے کی تصویر بہت اچھی لگی تھی کوائف بھی پچھلے رد کیے جانے والے بارہ رشتوں کے اسی میں موجود تھے بات آگے بڑھانے کی خاطر انھوں نے پوچھا۔

''خالہ! لڑکے والوں نے تم سے لڑکی کے کیا کوائف مانگے ہیں؟''

''کوائف؟ انھوں نے بس گوری، خوبصورت، پڑھی لکھی اور خاندانی لڑکی مانگی ہے.....''

''ہو.....ں.....'' کچھ سوچتے ہوئے شازیہ نے ہنکارا بھرا.....مطلوبہ صفات تو ساری موجود ہیں پر یہ صفات بالعموم ہوتی ہی ہیں.....اس لیے تسلی کے ساتھ الجھن یہ تھی کہ برادری جاٹ ہی ہے ناں۔

''سو فیصد جاٹ.....'' امیرن نے الجھن بھی دور کر دی۔

''باپ کا نام کیا ہے؟''

''نصیر الدین کاہلوں......ارے وہی جو حافظ والوں کے پیچھے رہتے ہیں......سبز گیٹ والی کوٹھی ہے جن کی......''امیرن نے کہا۔

''اچھا......چھا......''شازیہ نے ہکلاتے ہوئے کہا''انھوں نے تو دو شادیاں نہیں کر رکھیں؟''

''ہاں کی ہیں، کیا تمھارے سسر اللہ بخشے نے نہیں کی تھیں؟''امیرن نے ترت جواب دیا۔

''مگر میرے سسر کے تو اولاد نہ تھی......''انھوں نے کہا۔

''کتنے بچے ہیں دونوں بیویوں سے ان کے؟''شازیہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''بچے چار بیٹے اور تین بیٹیاں پہلی بیوی سے، تین بیٹے تین بیٹیاں دوسری بیوی سے ہیں......''امیرن ہر طرح سے یہ رشتہ کرانے کا سوچ کے آئی تھی پچھلے تین سالوں میں بارہ اچھے رشتے مسترد کر کے یہ آخری کوشش تھی۔

''کتنے شادی شدہ ہیں دونوں اولادوں میں؟''

امیرن نے انگلیوں پر کچھ حساب کتاب کیا اور کہا''چار بیٹے اور تین بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں......پر سچی بات کہوں بڑے سمجھدار لوگ ہیں ادھر بیٹے کی شادی کرتے ہیں کھیر ڈلوائی کرا کے گھر الگ لے دیتے ہیں۔کون ایسے کرتا ہے؟''انھوں نے شازیہ کو قائل کیا۔

''ٹھیک ہے میں ان سے مشورہ کر کے آپ کو فون کر دوں گی......''

شازیہ نے انھیں رخصت کیا۔میاں گھر آئے تو مذکورہ رشتے کے کوائف گنوانے شروع کیے۔تیرہ بچوں کے ذکر پر میاں کے چہرے کا رنگ بدلا......پھر جب شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی فہرست الگ کی تو چہرے کا رنگ ہی نہیں زاویے بھی بدل گئے......

امیرن بیگم کا حساب کتاب تو انگلیوں کی پوروں پر ختم ہو گیا تھا میاں نے جھٹ سے موبائل پر کیلکو لیٹر نکالا اور دیر تک ضرب جمع تقسیم کرتے رہے......کافی دیر تک سر نہ اٹھایا تو شازیہ بری طرح سے چڑ گئی۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟''

ایک منٹ خاموش رہو'شازیہ چپ کی چپ رہ گئی۔بالآخر تین چار منٹ کے بعد میاں صاحب گویا ہوئے۔

پہناؤنیوں کے ساس سسر کے تین، بچوں کے تیرہ، چار دامادوں اور تین بہوؤں کے چھ کاہلوں صاحب کے بہن بھائیوں کے اور پانچ مسز کاہلوں کے بہن بھائیوں کے، ٹوٹل چونتیس سوٹ بنتے ہیں۔شالیں، سویٹر جرسیاں ان پہناؤنیوں میں ان کے علاوہ ہیں۔فی جوڑا ہم پانچ چھ ہزار کا بھی رکھیں تو دو لاکھ سے کم نہیں بنتے......نہ نہ......''انھوں نے قطعیت سے انکار کیا......''ہر غمی خوشی پر دھیوں کے سر پر ہاتھ رکھیں نہ رکھیں ان کے سسرالیوں کو تو دینا پڑتا ہے......دو لاکھ میں لاکھ دو لاکھ اور جمع کر دیں تو آرام سے سیکنڈ ہینڈ گاڑی لے سکتے ہیں۔میں تو پھر اپنا کاروبار کام دھندہ ٹھپ کر کے کپڑے کی مل لگا لوں اور جوڑے ہی بنا بنا کے بھجواتا رہوں......''

''لیکن آپ یہ تو سوچیں کتنے رشتے ہم رد کر چکے ہیں۔کبھی لڑکا اکلوتا ہے، کبھی زمینیں نہیں ہیں کبھی رنگ کالا ہے......''

شازیہ آخر جوان جہان بچی کی ماں تھی، روہانسی ہو کر بولی......وہ خوب جانتی تھی کہ جٹ کی''ناں''ہاں میں بدلنا ناممکن ہے......اور اس سے بھی ناممکن ہے کہ دھی دھیانیوں کو دیے بغیر رخصت کر دیں......سو یہ رشتہ بھی رد کر دیا گیا......

☆......☆......☆

قریبی عزیزوں میں شادی تھی، شازیہ چاہتی تھی کہ اپنی دونوں بیٹیوں ماہم اور شاہین کو ساتھ لے جائے......آنے بہانے بات تو یہی تھی کہ

بیٹیوں کا رشتہ شاید اسی تقریب میں چھپا رکھا ہو...... بیٹیاں بھی روز روز کے ان قصوں سے تھک چکی تھیں...... ماننا تھا نہ مانیں اور شازیہ میاں کے ساتھ روانہ ہوگئی۔اب وہ تقریبات میں جاتی ضرور تھی لیکن جوش خروش مدھم ہو چکا تھا......دل ہی دل میں دعا گو رہی......یہیں کسی سے بات طے ہو جائے......شاید!!!

بے ہنگم ٹریفک کی وجہ سے شادی ہال میں پہنچے تو تقریب شروع ہو چکی تھی۔کھانا سرو ہورہا تھا......شازیہ نے پلیٹ میں کھانا ڈالا اور نسبتاً تنہائی والے گوشے میں چلی گئی۔اس کے سامنے کی کرسی پر شناسا سا چہرہ تھا ساتھ میں بہت باوقار، ڈیسنٹ سی نوبیاہتا لڑکی بھی......

اخلاقیات نبھاتے ہوئے اس نے سلام کیا۔

''آپ مسز شازیہ دین محمد ہیں ناں؟'' خاتون بولیں۔

''جی......اور......'' اوہ......ایک دم اسے یاد آیا یہ تو مسز نصیر الدین کاہلوں ہیں۔

''کیسی ہیں بھابھی آپ......'' مسز کاہلوں نے خوشدلی سے ان کا حال پوچھا اور اپنے ساتھ والی لڑکی کا تعارف کروایا۔

''یہ میری نئی بہو ہے، وقار کی بیوی......پچھلے ہفتے ہی شادی ہوئی ہے......''

شازیہ کا دل مٹھی میں آ گیا۔ابھی تو انکار کیے تین ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے......''اتنی جلدی کیسے ہوئی شادی!'' اس نے بے تکا سا سوال کیا۔

نوبیاہتا لڑکی مسکرائی۔''آنٹی ایک دن رشتہ آیا، اگلے دن ہاں ہوئی، تیسرے دن معاملات طے پائے، ساتویں دن شادی ہوگئی میری...... میری ساس بڑی ڈیسنٹ ہیں۔نہ لیا نہ دیا......سادگی سے رخصتی ہوگئی......'' لڑکی کا چہرہ ہر طرح کی ریا سے پاک تھا۔

مسز کاہلوں کے چہرے پر دلنواز سی مسکراہٹ تھی۔

''لو اس میں سادگی کی کیا بات ہے۔جس نے اپنے جگر کا ٹکڑا ہمیں دے دیا، اس نے پاس کیا رکھا؟ میں نے تو پہناوئیوں کے جوڑے بھی شکریے کے ساتھ واپس بھجوا دیے تھے۔جس نے اپنی بیٹی ہمیں دی اس کا شکر گزار ہونا چاہیے یا ان پر بوجھ بن جائیں؟؟ آپ خود ہی بتائیں شازیہ میں نے ٹھیک کیا ناں!!''

شازیہ گم سم سی بس ان کو دیکھے جا رہی تھی۔ہونٹ خاموش آنکھیں گیلی لیکن دل دھاڑیں مار مار کر چیخ چیخ کر بین ڈال رہا تھا...... ماتم کر رہا تھا۔جن رسموں کو توڑنے کے لیے جس بوجھ سے آزاد کرنے کے لیے نبیؐ برحق آئے وہ بوجھ اور رسموں کے طوق تو ہم نے خود سے پھر اپنے گلے میں ڈال لیے اور مشکلوں میں گھر گئے۔

☆......☆......☆

افشاں نوید

محرومی

جتنے سینے ہیں اتنی داستانیں......اور ہر داستان ایسی کہ سینہ شق کر دے......یہ کیسی دنیا تھی!

اس کے پاس صابن نہیں تھا نہانے کو......وہ کیسے نہاتی......کس کو بتاتی کہ اس کو صابن چاہیے...... یہاں کوئی اس کا پیارا تو نہیں جو اس کا خیال رکھے۔اور جو پیارے ہیں انھیں کہاں ہے فرصت کہ اس سے ملنے آتے......لوگ تو عزیزوں کی خوشی غمی میں ان کے گھر نہیں جاتے......پھر جیل آنے کے لیے تو حوصلہ درکار ہے۔اتنی ناپسندیدہ جگہ کون آنا پسند کرے گا!

یہ جیل کی دنیا بھی عجب دنیا ہے۔جیل کی راہداریوں سے گزرتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ جو 'معرفت' یہاں کی دنیا میں ہے وہ آزاد لوگوں کو کیسے نصیب ہوسکتی ہے!! ان قیدی عورتوں میں کون کون معرفت کی کن کن منزلوں میں ہے وہ خود ہی جانتی ہیں......کتنا فرق ہے ہماری دنیا اور یہاں کی دنیا میں......راستے میں گزرتے ہوئے لوگ 'سینٹرل جیل' پر نظر ڈالتے گزر جاتے ہیں۔شہر کے بیچوں بیچ واقع ہے یہ......مگر کون جانتا ہے اندر کی دنیا کے احوال......بلند و بالا دیواریں، مضبوط آہنی دروازے، قدم قدم پر پیچھا کرتی نگاہیں......ہر قدم پر اپنی شناخت پیش کی جائے۔

رمضان یا سیرت النبیؐ کے پروگرام کے موقع پر ہی آنا ہوتا ہے یہاں......ایک این جی او کے تحت درس و تذکیر کا سلسلہ ہوتا ہے ان قیدی خواتین کے لیے۔پھر وہ پورا ہفتہ بڑا مختلف گزرتا ہے۔جب جیل میں قیدی خواتین سے ملاقات ہوتی ہے......جتنے سینے ہیں اتنی داستانیں۔اور ہر داستان ایسی کہ سینہ شق کر دے۔

کتنی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے وہ کہیں سے بھی مجرم نہیں لگتی......نہ کوئی جرم ہے اس کا۔اس کا قصور یہ ہے کہ وہ شوہر کے قتل کی واحد عینی شاہد ہے، قاتل اس کو نقصان نہ پہنچا دیں اس لیے سیکیورٹی کے لیے اس کو جیل میں رکھا گیا ہے۔جب تک تمام قاتل پکڑ نہ لیے جائیں۔بمشکل ۲۵ برس عمر کی معصوم سی وہ لڑکی۔شادی کو محض ایک برس ہوا تھا۔کتنی گہری اداسی تھی اس کے وجود پر......سائنس کے مضامین میں بڑی یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگری ہے اس کے پاس......آہ اس کو کہتے ہیں نصیب!

رمضان کی فضیلت پر درس دیتے ہوئے میں فرداً فرداً ان کے چہرے پڑھنے کی کوشش کرنے لگی جو عادی مجرم ہیں یا سچ مچ مجرم ہیں ان کو چہروں سے پہچاننا کچھ ایسا دشوار بھی نہیں......جو بے گناہ ہیں یا سازش کے تحت ملوث کر دی گئی ہیں......سماج کے پسماندہ طبقے سے متعلق ہیں بے گناہی ثابت کرنے کے لیے وکیل بھی نہیں کر سکتیں۔یا بے گناہی ثابت ہوگئی ہے اور رہائی کے احکامات کی منتظر ہیں، ان کے چہرے مہرے الگ ہی پہچانے جاتے ہیں......

لیکن......

''گھر'' ہے......گھر کی قدر کوئی وہاں جا کر دیکھے......آزاد فضاؤں کی قدر کوئی ان سے پوچھے......وہ سب چاہتی ہیں کہ رمضان اور عید اپنے پیاروں کے درمیان گزاریں......اس کے لیے بیشتر نفلی روزے رکھ رہی ہیں......ہم سحر و افطار اپنے گھر کے دسترخوان پر کرتے ہوئے کبھی سوچ بھی نہیں پاتے کہ یہ گھر کتنی بڑی نعمت ہیں جو چھن جائیں تو سب خوشیاں گویا روٹھ جاتی ہیں۔

اللہ کے نبیؐ نے تو دنیا کو مومن کے لیے قید خانہ ہی بتایا تھا......مگر ''قیدی'' تو ایسے ہوتے ہیں......ان کے تو احساسات اتنے مختلف ہوتے ہیں

۔ہم تو ایک لمحہ کو بھی خود کو قیدی سمجھتے ہیں نہ مسافر...... جبکہ کہا گیا کہ دنیا میں ''مسافر'' کی طرح رہنا...... بھلا قیدیوں کے یا مسافروں کے...... ایسے ٹھاٹھ باٹ ہوتے ہیں...... دل لگی کے ایسے سامان ہوتے ہیں یوں عیش وعشرت اور ''ھل من مزید'' کی ہوس میں مدہوش روز وشب ہوتے ہیں ......قیدی تو ایسے ہوتے ہیں جن کے سراپے سے ان کے مجرم ہونے کا احساس ٹپک رہا ہوتا ہے۔ان سے بڑے گناہ ہوئے، ریاست کا ہاتھ ان کے گریبان تک پہنچ گیا......ان سے آزادی سلب کر لی گئی......ہم اپنے گناہوں کا اعداد وشمار کریں روزانہ کی بنیاد پر آٹھ دس گناہ بھی فرض کر لیں...... زبان ونظر......گمان وروپے کے......تو لاکھوں میں تعداد میں ہیں وہ گناہ......مگر ''عاصی'' ہونے کا وہ احساس ہم سے کوسوں دور ہے...... یہاں قید خانے کی ہر دیوار، ہر کھڑکی، ہر انسان، ہر رویہ انھیں ایک ہی احساس دلا رہا ہے کہ ''تم گناہ گار ہو''......اسی لیے تو کہا گیا تھا کہ دنیا کو ''قید خانہ'' سمجھو تا کہ اپنے گناہ گار ہونے کا ہر لمحہ احساس رہے۔مگر ہم تو طاق ہوگئے گناہ کرنے میں......نعمتوں کو اپنی خوش بختی اور اپنا حق سمجھنے لگے......نعمتوں کے چھن جانے کا کوئی تصور ہی نہیں قریب پھٹکتا ہمارے...... یہ قیدی عورتیں جن سے ان کے پیارے چھن گئے......ان کے نشیمن روٹھ گئے۔ان کو دنیا کی بھی معرفت نصیب ہوگئی کہ یہ دنیا دھوکے کی ٹٹی ہے۔میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''گھر جانے کو جی چاہتا ہوگا ناں!''

وہ ایک شانِ بے نیازی سے کندھے اچکا کر بولی ''نہیں!''

''کیوں مگر؟'' میں نے اگلا سوال کیا تو بیرک کے سامنے لگے درخت کے تنے سے سر ٹکاتے ہوئے بولی۔

''کیا کروں گی اس بے وفا دنیا میں واپس جا کر......سب دنیا کی حقیقت دیکھ لی میں نے......اپنے خون کے رشتوں کو بھی پرکھ لیا میں نے ...... یہ سب پانی کا بلبلہ ہے......کوئی اپنا نہیں یہاں......دھوکہ ہے سب دھوکہ۔''

''آہ! زندگی کا راز پا گئی یہ تو......!!اس دنیا کو اپنا گھر سمجھا...... یہاں بقا تلاش کی۔اس سے چمٹنے کی کوشش نے اندھا کر دیا......حلال وحرام کی تمیز مٹا دی...... کیوں کشت وخون کے بازار گرم ہوں؟ کیوں پرایا مال ہڑپ کریں؟ کیوں کرپشن میں نمبر ون ہوں؟ اگر اس رازِ زندگی کو پالیں کہ دھوکہ ہے یہ، سراب......سانس کی ڈور ٹوٹتے ہی جو دنیا آباد ہوگی اس دنیا کے مقابلے میں اس کی فکر کتنی غالب ہے؟ سارے سامان، سارے جتن تو میرے اس گھر اور اس زندگی کو خوبصورت بنانے کے ہیں۔ہم تو گھروں کو ابدی قیام گاہیں سمجھ بیٹھے......اور ہمیشہ یہاں رہنے کے سامان کرنے میں لگے رہے......ان کے گھر اُن سے چھنے تو ان کو دنیا کی حقیقت سمجھ آ گئی......

درس کے دوران ان میں سے بیشتر بری طرح روتی رہیں۔یہ رجوع کی کن منزلوں میں ہیں اور میں فرار کے راستوں پر گامزن ان کے ایک بڑے گناہ نے انھیں پلٹا دیا...... ہمارے چھوٹے چھوٹے گناہ ہمیں عادی مجرم بناتے رہے......مزید بے باک کرتے رہے......توبۃ النصوح کی توفیق ہی نہ مل سکی......جبکہ انسان کی پیدائش کے پہلے دن ہی یہ بات کھول کر بیان کر دی گئی تھی۔اللہ نے خود حضرت آدمؑ کو استغفار کے الفاظ سکھائے تھے......آپؐ نے خود اپنے بارے میں فرمایا کہ میں دن میں سو سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔لیکن میرے گناہ، میرے دل کے داغ میرے اور رب کے درمیان پردہ اور حجاب بن گئے ہیں۔

ان میں سے بیشتر بہت ٹوٹ کر واپس پلٹی ہیں۔اسی لیے شرمندگی کی آگ میں جل رہی ہیں۔کیا پتہ اس آگ نے کس کس کا میل کچیل جھاگ بنا کر نمایاں کر دیا ہو اور خالص جو ہر چھٹ کر الگ ہو گیا ہو......کتنی بڑی نعمت ہے یہ قید خانہ ان کے لیے جس نے دل کے سیاہ داغ مٹا دیے ......کتنی تڑپ کے ساتھ اس نے حمد پڑھی تھی ؎

گناہوں کی عادت چھڑا میرے مولا!

مجھے نیک انساں بنا میرے مولا!

میں قیدی عورتوں کے اٹھے ہوئے ہاتھ، چھت پر جمی نظریں دیکھ رہی تھی جیسے وہ التجا کرتے ہوئے خدا کو دیکھ رہی ہوں۔ سرخ ہو گئی تھیں بیشتر کی آنکھیں روتے روتے...... اپنے ''عاصی'' ہونے کا احساس دنیا کا کتنا قیمتی ترین احساس ہے...... غلطی تو انسان کی سرشت میں ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو وہ فرشتہ بن جائے۔ انبیاء کے سوا کون ہے جو غلطی سے محفوظ ہو۔ آپؐ نے اسی لیے اس حقیقت کو ان پیارے الفاظ میں بیان فرمایا کہ ابن آدم ضرور ہی خطا کرتا ہے لیکن بہترین خطا کار وہ ہیں جو گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے دروازہ مغفرت پر اپنی ندامت کی پیشانی رکھ دیں اور توبہ کر لیں۔ **خیر الخطائین التوابون**

انسانی عدالتیں مجرم کے خلاف شواہد اکٹھے کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کے بہانے ڈھونڈتا ہے...... نمازیں گناہوں کا کفارہ ہیں، روزے کفارہ ہیں، حج عمرے کفارہ ہیں، صدقہ خیرات کفارہ ہیں...... وہ چاہتا ہے کہ پاک صاف کر دے، گناہوں کی گندگی دور کر دے...... عاصی بندوں کو نہ قید کرتا ہے نہ ان سے آکسیجن چھینتا ہے نہ پانی...... نہ بولنے، سننے، دیکھنے، سمجھنے کی صلاحیتیں۔ بلکہ عطا پر عطا کیے جاتا ہے کہ بندہ شاید نعمتیں پا کر پلٹ آئے۔

جیل کے دروازے سے باہر آتے ہوئے برگد کے بوڑھے درخت کے پتے مجھ سے گویا تھے کہ ''انسان کے لیے بے توفیقی سے بڑھ کر کوئی محرومی نہیں۔''

☆......☆......☆

فریدہ خالد

پس ہے کوئی جو نصیحت قبول کرے!

ہمارے اردگرد روزانہ ایسے بے شمار واقعات رونما ہوتے ہیں کہ اگر ہم ان پر غور و فکر کریں تو ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور اپنی زندگیوں میں بہترین تبدیلیاں لا کر اپنی دنیا اور آخرت سنوار سکتے ہیں۔ ایسے ہی دو واقعات سننے کا مجھے حال ہی میں اتفاق ہوا۔

پہلا واقعہ میری بہن نازیہ، جو کہ کافی عرصے سے یوکے میں مقیم ہے، کے ساتھ پیش آیا اسی کی زبانی سنیں۔

''دوسری بیٹی کی پیدائش کے بعد میں ہسپتال میں تھی کہ ایک دن اچانک میری طبیعت خراب ہو گئی اور میں بستر پر ہی بے ہوش ہو گئی۔ مجھے اپنے اردگرد ڈاکٹرز کی ایک پوری ٹیم کھڑی محسوس ہوئی۔ کوئی میری نبض چیک کر رہا تھا تو کوئی مجھے آکسیجن لگانے میں مصروف اتنے میں کسی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر دبانا شروع کیا شاید مجھے CPR دے رہے تھے۔ مجھے ان کے دبانے سے بہت درد ہو رہا تھا اس لئے میں نے زور زور سے چیخنا چلانا شروع کیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے پوری طاقت لگا کر انہیں روکنے لگی مگر نہ تو میری آواز نکلی اور نہ ہی میں انہیں روک سکی وہ مسلسل مجھے دبا رہے تھے اور میں اپنے دونوں ہاتھوں سے پوری طاقت کے ساتھ ان کے ہاتھ اپنے سینے سے ہٹانے میں مصروف تھی اب میں نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا کہ مجھے چھوڑ دو مجھے بہت درد ہو رہا ہے لیکن کسی نے میری آواز نہ سنی! تھوڑی دیر بعد میری حالت بہتر ہو گئی اور انہوں نے CPR روک دیا۔ پھر میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنے اردگرد لوگوں کے چہروں پر اطمینان کی ایک لہر دیکھی جو خوشی سے مسکرا رہے تھے اس کے ساتھ ہی مجھے کچھ دوائیاں اور انجکشن لگائے گئے اور میں کافی بہتر ہو گئی۔ میں نے اپنے شوہر کو کہا کہ جب میں چیخ کر منع کر رہی تھی تو آپ نے ان سب کو کیوں نہیں روکا کہ وہ مجھے CPR نہ دیں۔ میرے شوہر نے کہا کہ ''تمہاری آواز تو دور کی بات ہونٹوں پر ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں نئی زندگی دی ہے شکر کرو''۔ واقعی میں

اللہ تعالیٰ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے توبہ کرنے اور اپنے اعمال کو بہتر بنانے کا ایک اور موقع دیا ہے‘‘۔

دوسرا واقعہ بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ دراصل میرے شوہر کے ایک دوست (واجد بھائی) ہسپتال میں داخل تھے ہم میاں بیوی ان کی عیادت کو گئے۔ اپنی طبیعت کی خرابی کا جو واقعہ انہوں نے سنایا انہی کی زبانی سنیئے۔

’’آفس کا کافی کام جمع تھا، سوچا کل ویک اینڈ ہے رات دیر تک جاگ کر ختم کرلوں تاکہ بےفکری سے سوؤں۔ لہذا میں اپنی فائلز لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا میری والدہ اور چھوٹی بہن اپنے شوہر اور دو عدد بچوں کے ساتھ کچھ دنوں کے لئے آئے ہوئے تھے اور سب کاموں سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کمروں میں سونے چلے گئے تھے۔ بیوی بھی چھوٹے بچوں کو لیکر سونے کے لئے لیٹ چکی تھی۔ بڑے بیٹے نے (عمر ۱۰ سال) ضد کر کے ماں سے اپنا فیوریٹ ٹی وی پروگرام دیکھنے کی اجازت اس شرط پر لے لی کہ وہ آواز بہت ہلکی رکھے گا تاکہ دوسروں کی نیند خراب نہ ہو۔

میں نے تندہی سے اپنا کام شروع کیا۔ رات کے ڈیڑھ بجے کا وقت ہوگا، اچانک مجھے شدید پیاس لگی۔ میں نے اٹھ کر قریب رکھی میز سے پانی کی بوتل لی، اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے سینے میں درد محسوس ہوا۔ میں نے بوتل سے پانی پینا چاہا مگر پانی میرے حلق سے نیچے نہ اترا۔ مجھے چکر سا آیا اور میں قریب کے صوفے پر جلدی سے بیٹھ گیا۔ میں نے پھر پانی پینا چاہا مگر پی نہ سکا۔ میں نے زور سے آواز دی کہ کوئی سنکر آجائے مگر آواز میرے حلق سے باہر نہ نکلی اس کے ساتھ ہی میرے سینے کا درد بڑھ گیا۔ اس قدر شدید درد اٹھا کہ اللہ کی پناہ! میں نے صوفے سے اٹھ کر اندر جانا چاہا لیکن قدم اٹھ نہ رہے تھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ایک ایک قدم من من بھاری ہو۔ میں پھر چیخا لیکن آواز مجھ تک ہی رہی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے اور میں چند گھڑیوں کا مہمان ہوں میں نے اللہ سے اپنی بخشش مانگی اور معافیاں مانگنے لگا۔ درد پھر شدت کا اٹھا میں نے زور سے ایک مکا اپنے سینے پر مارا اس سے کچھ ہمت محسوس ہوئی میں زمین پر گھسٹتا ہوا ٹی وی لاؤنج کی طرف آیا پانی کی بوتل میرے ہاتھ سے گر گئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ میرے بیٹے کو بوتل گرنے کی آواز نے متوجہ کیا وہ دوڑ کر میرے پاس آیا اور مجھے زمین پر پڑا دیکھ کر چلایا جس سے گھر کے لوگ آ گئے مجھے گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لایا گیا میرا بھائی مسلسل میرا سینہ رگڑ تا رہا جس سے مجھے سکون محسوس ہوتا رہا۔ مجھے اپنی امی کے رونے کی آواز آتی رہی اپنی بیوی اور بہن کی پریشانی سنائی دیتی رہی۔ میں انہیں مسلسل کہتا رہا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے لہذا کلمہ پڑھیں اور یہ کہ مجھے معاف کردیں لیکن بقول ان کے میں تو تمام راستے بیہوش ہی پڑا رہا۔

ہسپتال میں ایمرجنسی ٹریٹمنٹ کے بعد مجھے کارڈیک یونٹ میں داخل کر دیا گیا۔ پہلی مرتبہ موت مجھے بہت قریب محسوس ہوئی جسے میں بھولا ہوا تھا۔ ہوش میں آتے ہی میں نے سب سے معافیاں مانگیں اس پر گھر والے اور رونے لگے لیکن مجھے احساس ہوا کہ انسان کسقدر بے بس اور کمزور مخلوق ہے اور موت کس طرح ہر وقت اس کے سر پر منڈلاتی رہتی ہے۔ اللہ کا بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے توبہ کرنے اور اپنی اصلاح کا ایک اور موقع دیا‘‘۔

ان دونوں واقعات کو سنکر مجھے قرآن کی کئی ایک آیات یاد آ گئیں۔ ارشاد ہوتا ہے، ’’اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کسی ذی روح کو موت نہیں آسکتی، اسکا مقرر شدہ وقت لکھا ہوا ہے‘‘ (آل عمران: ۱۴۵) یقیناً موت کا اپنا وقت مقرر ہے لیکن ہم سب کے لئے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر ابھی مجھے موت آجائے تو کیا آخرت کے لئے میری تیاری مکمل ہے؟ یا میں نے اس یقینی سفر کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ یا یہ کہ ’’ابھی تو بہت وقت ہے بڑھاپے میں نیک عمل کرلیں گے‘‘۔ حالانکہ گزرنے والا ہر دن ہمیں بتاتا ہے کہ ہم اپنی موت کے قریب اور زندگی سے دور ہو رہے ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے۔ ’’اے انسان! بیشک تو چلا جا رہا ہے اپنے رب کی طرف کشاں کشاں، بالآخر تو تجھے اسی کے حضور پیش ہونا ہے‘‘ (الانشقاق: ۶) ایک اور جگہ فرمایا ’’کہہ دیجیے! جس موت سے تم بھاگتے پھرتے ہو وہ تمہیں پہنچ کر رہے گی، پھر تم چھپے کھلے کے جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور وہ تمہیں تمہارے کیے ہوئے تمام کام بتلا دے گا‘‘ (الجمعہ: ۸)، اور یہ کہ ’’پھر جب اس کا وقت آجائے گا تو ایک گھڑی نہ پیچھے رہ سکتے ہیں اور نہ ہی آگے بڑھ سکتے ہیں‘‘ (النحل: ۶۱)۔

یہ دونوں واقعات میری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھے۔ مجھے قرآن کی کئی ایک آیات کا مفہوم اس طرح سمجھ آیا جیسے پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ اس بات پر میرا شرح

صدر بڑھا کہ موت کے وقت فرشتے مرنے والے سے بات چیت کر رہے ہوتے ہیں اور اس کے اعمال کے مطابق اس سے معاملہ کرتے ہیں لیکن ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہ وہ سنائی دیتے ہیں اور نہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے نازیہ اور واجد بھائی کی آوازیں ان کے ارد گرد موجود لوگوں کو سنائی نہ دے رہی تھیں اور بظاہر وہ دونوں بیہوش نظر آ رہے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے، ''وہ جن کی جانیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک اور صاف ہوں وہ انہیں کہتے ہیں کہ تمہارے لیئے سلامتی ہی سلامتی ہے داخل ہو جاؤ جنت میں ان اعمال کے بدلے میں جو تم کیا کرتے تھے'' (النحل:۳۲)۔

اسی ضمن میں ایک حدیث بھی میرے ذہن میں آئی۔ سیدنا ابو ہریرہؓ سے روایت ہے ''فرشتے روح قبض کرنے کے لئے جب مرنے والے کے پاس آتے ہیں تو اس کے نیک اور صالح ہونے کی صورت میں کہتے ہیں، ''اے پاک روح! تو پاک جسم میں تھی، اب تو جسم سے نکل آ، تو خوبی والی ہے اللہ کی رحمت سے خوش ہو جا، تیرے لئے جنت کی نعمتیں ہیں، تیرا رب تجھ سے راضی ہے'' (ابنِ ماجہ)۔ احمد کی روایت کے مطابق رسول اللہ نے یہاں یہ بھی فرمایا ''چنانچہ روح جسم سے اس طرح آسانی سے نکل آتی ہے جیسے مشکیزہ کے منہ سے پانی کا قطرہ بہہ نکلتا ہے''۔ ایک اور حدیث کا مفہوم ہے کہ جب مومن کی وفات کا وقت آتا ہے تو فرشتے جنت کا کفن اور خوشبو لے کر آتے ہیں اور حدِ نگاہ تک بیٹھ جاتے ہیں، آخر میں ملک الموت آتے ہیں اور اس میت کے سرہانے بیٹھ کر فرماتے ہیں، اے مطمئن روح! پہنچو اپنے رب کی مغفرت اور عنایت کے پاس چنانچہ وہ نہایت آسانی سے جسم سے نکلتی ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ''جب جنازہ تیار ہوتا ہے اور لوگ اسے اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں نیک آدمی کہتا ہے مجھے جلدی لے چلو مجھے جلدی لے چلو، اگر نیک نہ ہو تو کہتا ہے ہائے ہلاکت! مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ میت کی آواز انسانوں (اور جنوں) کے علاوہ ساری مخلوق سنتی ہے، اگر انسان سن لے تو بے ہوش ہو جائے۔'' (بخاری) آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ''جب تم کسی مریض یا مرنے والے کے پاس ہو تو صرف اچھی بات کہو، کیونکہ فرشتے تمہاری بات پر آمین کہتے ہیں'' (مسلم) حضرت ابو ہریرہ سے ہی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا'' میت جب قبر میں دفن کی جاتی ہے تو وہ پسماندگان کے (واپس لوٹتے وقت) جوتوں کی آواز سنتی ہے'' (طبرانی، حاکم)۔

دوسری طرف کافر کی موت کا وقت سورہ الانفال (۵۰۔۵۱) میں یوں بیان ہوا ہے ''اور کاش تم اس وقت دیکھو جب فرشتے کافروں کی جان قبض کر رہے ہوتے ہیں، وہ ان کے چہروں اور پہلوؤں پر مارتے اور (کہتے ہیں) کہ اب عذاب آتش (کا مزہ) چکھو، یہ اس (گناہ) کی سزا ہے جسے تمہارے ہی ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا اور بے شک اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے''۔ ایک اور جگہ فرمایا ''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آنے لگتی ہے تو کہتا ہے کہ اے میرے رب! مجھے واپس لوٹا دے، کہ اپنی چھوڑی ہوئی دنیا میں جا کر نیک اعمال کر لوں، ہرگز ایسا نہیں ہوتا'' (المومنون:۹۹۔۱۰۰)۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ''...مرنے والا اگر برا آدمی ہو تو (روح قبض کرنے والے) فرشتے اس سے یہ کہتے ہیں، ''اے خبیث روح! نکل (اس جسم سے) تو خبیث جسم میں تھی، نکل اس جسم سے ذلیل ہو کر اور بشارت ہو تجھے کھولتے پانی کی، پیپ کی اور ایسے دوسرے عذابوں کی''۔ فرشتے روح نکلنے تک مسلسل یہی کہتے رہتے ہیں'' (ابنِ ماجہ)۔

ان دونوں واقعات اور قرآن و سنت کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ انسان کو Near death experience دے کر اسے اپنے لئے اور دوسروں کے لئے باعثِ عبرت بناتا ہے تاکہ عقلمند اس سے نصیحت پکڑیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے ''ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لئے آسان ذریعہ بنا دیا ہے، پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا'' (القمر:۴۰)۔

☆☆☆

عالیہ شمیم

صبحِ امید

رات کی تیز بارش نے پورے ماحول کو جل تھل کر رکھا تھا۔ گھاس، پھونس پودے تو بے شک دھل کر نکھر گئے تھے مگر جس طرف گھاس نہ تھی وہ جگہ دلدل کا منظر پیش کر رہی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ ہوا میں نمی ابھی مزید بارش ہونے کے آثار بتا رہی تھی۔

صبح کا منظر تو ویسے ہی بھلا محسوس ہوتا ہے اور یہ تو پھر برسات کی صبح تھی۔۔۔ ہلکی سی کہر اور دھند میں لپٹی ہوئی ابر آلود۔ وہ باغ کے مخصوص گوشے میں بنچ پر بیٹھا ماحول کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بنچ گیلی تھی مگر اس کو اچھی لگ رہی تھی۔ پچھلے چند برس سے وہ ہر صبح باغ کے اسی گوشے میں ضرور آتا تھا۔ عمر کے آخری حصے میں جبکہ عمر کا پنچھی تیزی سے اپنے سفر کی طرف گامزن تھا اسکو یہاں بیٹھ کر بیتے ماہ و سال یاد کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اور پچھلی رات تو 14 اگست کی رات تھی جو ہر سال اسکو بہت کچھ یاد دلاتی تھی اس پر جان چھڑکنے کو 6 بہنیں، جو کھانے کے وقت اسکے اطراف میں کنیزوں کی طرح کھڑی ہو جاتیں، کٹورا خالی ہوتے ہی پانی سے بھر دیا جاتا۔ روٹی سالن مزید مانگنے کی نوبت نہ آتی، سر اٹھاتے ہی ہر چیز سامنے کر دی جاتی۔ اسکے دوست اسکی محبت، کچی چناروں، جھاگ اڑاتے جھرنوں سے مزین اسکی وادی جنت نظیر کشمیر...... وہ پھر سے اداس ہو گیا۔ پوری رات وہ سو نہیں سکا تھا۔ اسکو پاکستان کے حصول کیلیے دی ہوئی قربانی نے نہیں جگایا تھا۔ بلکہ رات بھر پٹاخوں، آتش بازی، سائلنسر سے آزاد موٹر سائیکلوں اور نوجوانوں کی ہا ہو نے اسے بے چین کر دیا تھا موسیقی کے تیز و بے ہنگم شور کی لے میں منایا جانے والا جشن آزادی اسکے رستے زخموں کو کھرچ گیا تھا۔ جیسے زخموں کے کچے ٹانکے ادھڑ جائیں اور زخموں سے جاری خون کسک و تکلیف سے دوچار کر دے۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھنا شروع کر دیا جن سے اپنی بہنوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

وہ وقت جب ست سری اکال کے نعروں کے ساتھ چمکتی کرپانیں لیے ہزاروں سکھ اسکے گھر کے دروازے کو توڑتے اندر آ گئے تھے۔ راستے میں حائل ماں، باپ بھائی کو اچھالتے دھکیلتے وہ اسکی بہنوں کے کمرے کی طرف آنے لگے تھے اور ٹھیک اسی وقت اس نے اپنے ہی ہاتھوں سے ان کو موت سے ہمکنار کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی اور اس کی ماں جایوں نے آخری وقت میں بھی اپنے لاڈلے بھائی کی حفاظت میں سستی نہیں دکھائی تھی۔ 6 لاشوں کے جھرمٹ میں سکھ اسکو بھی مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے اور اب بچ جانے والا وہ اپنے خاندان میں واحد شخص رہ گیا تھا جو ہر سال ان لمحوں کو یاد کر کے روز جیتا اور روز مرتا تھا۔

بٹ	کے	رہے	گا	ہندوستان
لے	کے	رہیں	گے	پاکستان

اس نعرے کی گونج میں وہ بھی تمام تر جوش و جذبے سے شامل تھا جب ہر جگہ ہر راستے گلی، چوراہے، چوپال پر ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں بحثیں ہوتیں۔ مسلم لیگ اور کانگرس کے بارے میں بات چیت ہوتی۔ گاندھی، نہرو، محمد علی جوہر، لیاقت علی خان، محمد علی جناح کا آپس میں موازنہ کیا جاتا اس وقت اسکے جسم میں علامہ اقبال کے اشعار لہو بن کر دوڑتے تھے۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ جس حقیقت کو وہ پا گیا ہے اس سے اپنے تمام دوستوں، ساتھیوں، محلے داروں اور ہر جگہ جہاں بحث و مباحثہ ہو رہے ہوں وہاں روشناس کروا دے۔ اقبال کے تصور پاکستان کو دلوں میں موجزن کروا دے۔ اسکی زبان پر آج بھی مفکر اسلام علامہ اقبال کے خطبہ الہ آباد کے وہ الفاظ رواں تھے جسمیں انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ، آزاد، خود مختار مملکت کا تصور پیش کرتے ہوئے واضح کیا تھا کہ اسلام صرف چند عقائد و عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ خاص انداز سے معاشرے کا خالق ہے۔ معاشرتی، معاشی یکجہتی و اجتماعیت کے اعتبار سے برصغیر میں اگر کوئی جماعت واحد قوم کی

حیثیت رکھتی ہے تو وہ ''مسلمان'' ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ آڑے وقتوں میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا، جبکہ مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ انہوں نے شرکاء سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا کہ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اسکے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سر نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔ اسوقت اقبال کی فکری رہنمائی انجام کار ''نظریہ پاکستان'' کی اساس بنی تھی اور بہت سے سرفروشوں کے ساتھ وہ بھی پاکستان کی تخلیق میں ان کروڑوں مسلمانوں کے قافلے میں شامل ہو گیا تھا جن میں دینی جوش و خروش چٹانوں جیسی پختگی اور دین و مذہب کی محبت قابل تعریف تھی اسوقت اسکی زبان پر ہمہ وقت ہی جاری رہتا۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے

انہی سوچوں میں غلطاں وہ بنچ پر بیٹھا اپنے اطراف سے بے خبر تھا جہاں واکنگ ٹریک پر اب آنے والوں کو تانتا بندھنے لگا تھا۔ نوجوان، درمیانی عمر کے لوگ، لاٹھی ٹیکتے بزرگ، جاگنگ کرتے پرجوش لڑکے .... جبھی یکا یک اسکے پیروں میں کوئی چیز چبھی۔ چونک کر اس نے نیچے دیکھا۔ مسلی ہوئی جھنڈی اسکے پیروں تلے دبی تھی اور شاید کوئی کانٹا چبھا تھا۔ اس چبھن سے بے نیاز ہو کر اس نے عقیدت سے وہ جھنڈی اٹھالی اور پھر ایک، دوسری، بہت ساری جھنڈیاں اسکو نظر آنے لگیں، مسلی ہوئی، پھٹی ہوئی، جوتوں تلے کچلی ہوئی، کیچڑ میں لت پت ایک لڑی کی صورت میں یہ جھنڈیاں اپنی بے توقیری پر نوحہ کناں تھیں

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کیچڑ میں لت پت چاند تارے کو دیکھ رہا تھا جسکی عظمت کو بلند رکھنے کیلئے اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ وہ دیوانہ وار گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ان جھنڈیوں کو اٹھانے لگا تھا جب ہی اس کے کانوں میں قریب سے گزرتے آپس میں باتیں کرتے کچھ نوجوانوں میں سے ایک کی آواز آئی۔

ارے اس بوڑھے کو تو دیکھو، اتنی ٹھنڈ میں نیچے بیٹھا کیا کر رہا ہے۔

وطن کی پاسبانی...... دوسرے نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ دیکھ نہیں رہے۔۔۔ نیچے گری جھنڈیاں سمیٹی جا رہی ہیں۔

سنکی لگتے ہیں مجھ کو ایسے لوگ۔۔۔ بکھری زلفوں، کھلے گریبان، گلے میں چین، کانوں میں پڑی بالیوں کو ہلاتے ہوئے تیسرا بولا۔

انتہا پسند، خوابوں میں رہنے والے آزادی کا درس دینے والے ہونہہ۔۔۔۔ چوتھے نے بھی لب کشائی کی۔ ارے میں تو کہتا ہوں ہندو، مسلمانوں کو سارے اختلافات بھلا کر اب دوستی کر لینی چاہئے۔ میں تو امن کی آشا کا پیامبر ہوں۔ ہندو مسلم کے درمیان بھائی چارہ اب وقت کی اہم ضرورت ہے اخلاقی برائیوں اور معاشرتی خرابیوں میں گلی سڑی سوسائٹی کا تعفن اسکے لہجے سے عیاں تھا۔

ویسے اسعد کی بات کی تو میں بھی تائید کرونگا۔ پانچویں نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ کیا ملا ہمارے آباواجداد کو اتنا خون بہا کر۔۔۔ جس خطہ زمین کو حاصل کیا تھا وہ بھی اب لنگڑا لولا ہو چکا ہے۔

ساری اکانومی خطرے میں پڑ چکی ہے۔ آج ہم میں سے ہر فرد حتیٰ کہ پیدا ہونے والا بچہ بھی امریکا کا مقروض ہے۔ 35ارب ڈالر کا قرضہ امریکہ چڑھا چکا ہے۔ ایسی آزادی کس کام کی جہاں جینے کے لیے بنیادی اشیاء کا حصول بھی ناپید ہو چکا ہو۔ جہاں مائیں بچوں کو زہر دے کر خود بھی خودکشی کر لیتی ہیں۔ ہم تو امداد پر زندہ رہنے والی قوم ہیں۔ بغیر امداد کے کچھ دن بھی ہمارا نظام نہیں چل سکتا۔ ہماری ہر حکومت پچھلی حکومت سے بدتر ثابت ہوتی ہے ایک نعرہ باز اور کرپٹ قوم بھلا کیسے اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہے!

سب بیکار کی باتیں ہیں، جشن آزادی، چراغاں منانا مذہب کا پرچار کرنا، اقبال کے افکار کو، خودی کو یاد دلانا۔۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ عملی زندگی

میں دولت ہی سب کچھ ہے۔

وہ ٹولا تو باتیں کرتا گزر گیا تھا اور وہ بوڑھا آنے والے وقت کے اندیشوں سے لرز اٹھا۔ یہ کس قسم کی نسل اٹھ رہی ہے کیا اب ستاروں پر کمند ڈالنے والے نوجوان نہیں ہونگے وہ بے اختیار بڑبڑایا۔ دکھ تاسف وملال نے اس کو جکڑ لیا تھا جب ہی چند بھاگتے دوڑتے قدم اس کے نزدیک آ کر رک گئے۔ اسکول کے چند بچے سفید یونیفارم میں اپنے t . p ٹیچر کے ہمراہ چمکتی آنکھوں کے ساتھ گری ہوئی جھنڈیاں دیکھ رہے تھے۔ ایک بچے نے جھک کر بڑے شوق سے لڑی میں پروئی ہوئی جھنڈیاں اٹھائی تھیں اور دوسرے بچے ان جھنڈیوں کو صاف کرنے کی کوششوں میں اپنے لباس پر لگ جانے والے داغوں سے بے نیاز تھے۔ بوڑھا فورِ مسرت سے ان کو اردگرد سے بے نیاز دیکھ رہا تھا۔ جبھی ٹیچر کی آواز پر تمام بچے واپس مڑ گئے تھے مگر جاتے جاتے اس کو زمین سے اٹھا کر بنچ پر بٹھانے میں مدد دے کر اپنے ساتھ جھنڈیاں لے جانا نہ بھولے تھے۔ اور اب وہ بوڑھا کچھ دیر پہلے کا ملال، غم واداسی بھول کر خوشی کے احساس کے ساتھ پرامید نگاہوں سے مستقبل کے ان معصوم معماروں کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ سکون وطمانیت کی لہر اس کے اندر جاری ہوگئی تھی کہ ابھی پاکستان کا مستقبل محفوظ ہے۔

☆☆☆

حفصہ محمد اقبال

گمنام سپاہی

ایک ایسے سپاہی کے جذبات کی ترجمانی جو بعض بہتوں میں سے صرف ایک ہوتا ہے...... وہ گمنامی کی زندگی سے آتا ہے، اور گمنامی کی موت مرجاتا ہے...... ایسے ہر سپاہی کو آنکھیں اشکوں سے سلام کرتی ہیں!

میں پاک فوج کا ایک گمنام سپاہی ہوں...... درختوں کے اس جھنڈ میں جہاں زمینی کیڑوں کی بہتات ہے اور مچھروں کی بھنبھناہٹ رات کے سناٹے میں چھید کرنے کو کافی ہے، مجھے پوزیشن لیے زیادہ دیر نہیں گزری...... شاید دو گھنٹے یا اس سے کچھ زیادہ...... یہ ایک انتہائی حساس مقام ہے جہاں ہلکی ہلکی سی حرکت کی صورت میں مجھے مقابل کو بھون دینے کی ہدایات ہیں......

بارود کی پیٹی کمر پہ لادے، میں اپنی پسندیدہ رائفل کو یوں تھامے بیٹھا ہوں جیسے ایک منجھا ہوا شکاری اپنے شکار کو دیکھ کر نشانہ باندھ لیتا ہے۔ یہاں فی الحال دور دور تک کسی ذی روح کا نام ونشان نہیں ہے...... یہاں تک کہ آج تو آکاش کے اُن باسیوں کا بھی ساتھ نہیں ہے جو تنہا مسافروں کا حوصلہ ہوا کرتے ہیں...... رات اس قدر گھور اور خاموش ہے کہ میں اپنی داہنی طرف بالکل سن ہوجانے کے باوجود بھی اپنے جسم کا بوجھ بائیں طرف منتقل نہیں کر رہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے اس عمل سے موقع ملتے ہی، میرے بھاری بوٹوں تلے سانس روک کر دبے خشک پتے، تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھیں اور رات کی خاموشیوں کو فنا کر ڈالیں...... جب میں یہاں آیا تھا تو مجھے اپنی نگاہیں اندھیرے سے مشابہ کرنے میں کافی جدوجہد کرنا پڑی تھی لیکن اب گویا میری آنکھوں میں ''رات کے پرندے'' کی آنکھوں کا نور اتر آیا ہے جس نے ہر منظر کو مجھ پہ ٹھیک ٹھیک واضح کر رکھا ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے مجھ سے تقریباً دس قدم کے فاصلے پہ ہونے والی ایک نامانوس سی حرکت نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تو میں یکدم ٹھٹک گیا...... کوئی لمبی سی بل کھاتی ہوئی چیز تھی جو خشک پتوں پہ آگے کو رینگتی جاتی تھی۔ سمجھ آ جانے پہ میں نے بے اختیار ایک لمبی سانس لیتے ہوئے اس درخت کے مضبوط تنے سے سر ٹکا دیا جو آج کی رات کے لیے میری عارضی قیام گاہ ہے۔

زمینی کیڑوں سے ڈرنا اور خوف کھانا ہم فوجیوں کی شان کے خلاف ہے بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی جگہ پہ گھات لگائے بیٹھے ہوتے ہیں اور ہمارے جسموں کے اوپر سے انتہائی خاموشی کے ساتھ، کوئی چاپ پیدا کیے بنا سانپ رینگ جاتے ہیں۔ بچھو ہمارے پیروں کو چھوتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے ساکت جسموں میں ہلکی سی جنبش تک پیدا نہیں ہوتی۔ جب آپ خود موت کے منہ میں جانے کے لیے بیتاب ہوں تو موت آپ کو نگلنے میں ہمیشہ دشواری محسوس کرتی ہے۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں کسی درخت کی کھوہ میں بیٹھے، جھاڑیوں کے کسی جھنڈ میں منہ چھپائے، کسی ندی نالے کے کنارے گھات لگا کر بیٹھے ہوئے......کسی سانپ یا بچھو کے ہاتھوں موت کا جام نہیں پینا چاہتا۔

میرے داہنے بازو پہ ابھی بھی وہ امام ضامن موجود ہے جو گھر چھوڑتے ہوئے میری دادی نے مجھے اپنے ضعیف ہاتھوں سے باندھا تھا اور اسے باندھتے ہوئے جو الفاظ اس نے ادا کیے تھے اس کے اجلے نقش ابھی تک اس کپڑے کی تہوں میں موجود ہیں۔

''تمھارے دادا کے ۶۵ء کی جنگ کے کارنامے لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ جب انھوں نے اپنے ایک افسر کو بچاتے ہوئے پچاس دشمنوں کو موت کے منہ میں دھکیلا تھا۔ وہ اپنی جان پہ کھیل گئے تھے لیکن اپنے افسر کے جسم پہ خراش تک نہ آنے دی تھی۔

اور تمھارے ابا کی شہادت کے موقع پر موجود ہر فوجی نے گواہی دی تھی کہ دشمن کا پلڑا بھاری ہونے کے باوجود اُس نے لڑتے لڑتے اپنی جان دے دی تھی لیکن پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔

مجھے امید ہے کہ تم اپنی خاندانی روایت کو برقرار رکھو گے۔''

یہ کہتے ہوئے ان کے سلوٹ زدہ ہونٹوں نے میری چوڑی پیشانی چوم لی تھی......وہ بوسہ......جس کی لذت میں ابھی تک اپنی پیشانی پہ محسوس کر سکتا ہوں۔ اور ان کے الفاظ ہر دم میرے کانوں میں گونجتے ہوئے، مجھے میرا مقصد یاد دلاتے رہتے ہیں۔ وہ مقصد...... جو ہر فوجی کے دل پہ، کسی تیز دھار چیز کی مدد سے کھدا ہوتا ہے...... جو اُسے ہمہ وقت ایک لذت بھرا درد دیتا رہتا ہے۔

ہمارے سروں پہ سہرے کم ہی سجا کرتے ہیں، ہمیں شہادت کے تاج کی تمنا ہوتی ہے۔

ہماری مائیں جب راتوں کو اٹھ کر تاروں بھرے آسمان تلے اپنی جھولی پھیلاتی ہیں تو ان کے گالوں پہ لڑھکتے آنسو وہ دعا مانگا کرتے ہیں جو ان کے لرزتے لب مانگنے کا حوصلہ نہیں رکھتے......''شہید'' لفظ میں وہ اعزاز چھپا ہے کہ دنیا کا ہر باشعور مسلمان کسی نہ کسی حوالے سے اس اعزاز کے ساتھ نتھی ہونے کی ''پاکیزہ حرص'' رکھتا ہے۔

''میں تو پاک فوج کا ایک ادنیٰ سا سپاہی ہوں......بعض اوقات مجھے شدت سے اس چیز کا قلق ہونے لگتا ہے کہ ہمیں شجاعت اور بہادری کا کوئی بڑا کارنامہ دکھانے کا موقع کم ہی ملا کرتا ہے...... حالانکہ جب جنگ چھڑتی ہے تو ہم فرنٹ لائن پہ موجود ہوتے ہیں...... فتح کا دارومدار ہمارے ہاتھوں میں موجود آتشیں ہتھیاروں پہ ہوتا ہے......ہم خود اپنے ہاتھوں سے موت کے پروانوں پہ پکے دستخط کر کے نکلتے ہیں......

ہمارے کندھوں پہ ٹکی بندوق کی نال آگ اگلنے کو بے چین ہوتی ہے...... پیچھے سے حکم آتا ہے: ''آپ کے سامنے enemy موو کر رہا ہے، اس کو انگیج کرو۔''

اور ہم ٹریگر پہ ہاتھ رکھ کر ہٹانا بھول جاتے ہیں......ایک کے بعد ایک جسم مردہ ہو کر ہمارے سامنے گرنے لگتا ہے یہاں تک کہ خود ہمارا اپنا وجود دشمن کے ہتھیار سے نکلی اندھی گولیوں کی زد میں آجاتا ہے......اور ہم گولیوں سے چھلنی سینہ لیے وہیں ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

بالآخر جنگ کا خاتمہ ہوتا ہے...... رائفلز کی خاموش ہوتی نالیوں میں سے دھواں اٹھنے لگتا ہے......اور ہماری شہادت کسی بڑے فوجی کے جرأت و بہادری کے اعلیٰ کارنامے تلے کہیں چھپ جاتی ہے......دب جاتی ہے۔

ہمارے سینوں پہ کوئی ''ستارۂ جرأت'' نہیں سجایا جاتا......کوئی نشانِ حیدر ہمارا مقدر نہیں بنتا......ہم بہادری کا وہ اعلیٰ تمغہ لیے، چپ چاپ اِس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں جن کے لیے ہماری ماؤں نے ہمیں میدانِ جنگ میں بھیجا ہوتا ہے۔اور ان کے جھریوں سے بھرے چہرے کی ایک ایک سلوٹ میں، اعزازوں سے بھرا وہ تمغہ حاصل کرنے کی تڑپ اور راتوں کی تاریکی میں مانگی اس ''خاموش دعا'' کے دائمی نقش موجود ہوتے ہیں......

ہم عظیم ماؤں کے بیٹے ہیں...... ہمارے مقاصد بھی عظیم ہوتے ہیں۔رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے......ابھی کچھ دیر میں ہی افق کنارہ دمکنے لگے گا۔ابھی تک میری عقابی نگاہوں کے حصار میں کوئی دشمن نہیں آیا...... یہاں اب بھی ویسی ہی خاموشیوں کا راج ہے، جیسی شروع رات میں تھیں۔

شاید آج کے دن کے لیے میری اور میرے رب کی ملاقات کا وقت ہی مقرر نہیں ہوا تھا......اس ملاقات کے لیے مجھے ایک دفعہ پھر سے ''انتظار'' کرنا ہوا۔ گھنے درختوں کی کسی کھوہ میں، خاردار جھاڑیوں کے کسی جھنڈ میں یا پھر کسی ندی کنارے......خاموش پانیوں کی گہری وسعتوں کے پاس۔

یہ انتظار بڑا ہی تکلیف دہ ہے......اس میں درد ہے......اذیت ہے......لیکن اس سب میں بھی ایک لذت ہے۔وہ لذت جو شہادت پانے والے کو ملتی ہے۔وہ اس لذت کو پانے کے لیے دوبارہ سہ بارہ دنیا میں جانے کی تمنا کرتا ہے۔اسی آرزو کے ساتھ مجھے اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن پورے کرنے ہیں۔

☆......☆......☆

نزہت ظفر

ننھی پری

''مہر النساء تم بھی! سکول گرل کی طرح شوخیاں کرتی ہو۔کسی وقت تو سنجیدہ ہو جایا کرو''۔سجاد نے گھور کر مہر النساء کو دیکھا۔ایک چبھتا نشتر مہر النساء کے دل سے پار ہو گیا۔

''میں شوخیاں اس لیے کرتی ہوں کیونکہ میں ایک سکول گرل ہی ہوں۔میری ساتھی لڑکیاں سب ابھی میٹرک میں ہیں''۔مہر النساء کی آواز تلخ ہو گئی۔

''میں نے تو نہیں کہا تھا کہ سکول چھوڑ کر بیاہ رچا لو''۔سجاد جو ہر وقت غصے میں بھرا رہتا تھا، پھٹ پڑا۔

اُس کا کام بھی ایسا ہی تھا، وہ پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔دن بھر مجرموں اور عدالتوں کے چکر لگا کر تھک کر چُور ہو جاتا۔ایک سال پہلے ہی اس کی

شادی اپنے ماموں کی بیٹی مہر النساء سے ہوئی۔ پہلے گھر کے بکھیڑے سنبھالتا رہا اور عمر انتیس برس کی ہو چلی، تین بہنوں کی شادیاں کر چکا، تو اماں نے آس پاس لڑکی تلاش شروع کرنی شروع کی۔ پھر خیال آیا کہ اپنے بھائی کے ہاں چھ بیٹیاں ہیں۔ بھائی اور بھابی مشکل سے گھر کے اخراجات چلاتے ہیں۔ مہر النساء ہی بڑی بیٹی تھی نویں میں پڑھتی تھی جب اُس کا رشتہ مانگنے بھائی کے ہاں گئی تو وہ حیران ہوگئے۔ ''ابھی تو مہرو پڑھ رہی ہے اور سجاد تو مہرو سے بارہ پندرہ برس بڑا ہے''۔ مہرو کے ابا ایاز کو یہ بات بڑی عجیب لگی مگر امی اِس رشتے پر فوراً آمادہ ہوگئیں۔ چھ بیٹیاں اور تین بیٹے، پھر خود اُن کی صحت دن بدن دگردوں ہوتی جا رہی تھی۔ انہوں نے اپنے شوہر کو منوا لیا اور جھٹ منگنی پٹ بیاہ کر کے مہر النساء سجاد کے گھر آ گئی۔ ''چلو امتحانوں سے تو جان چھوٹی''۔ مہرو نے سوچا۔ جب اُس کی دوست سائرہ اُس سے ملنے آئی تو شادی کا اُس وقت مہر النساء کو بس یہی ایک فائدہ نظر آیا۔ ورنہ تو باقی جو خواب اُس نے دیکھے تھے وہ سب ایک سراب ثابت ہوئے۔

مسلسل کام...... سجاد کو ہر چیز صاف چاہیے تھی۔ تھکا ماندہ جب گھر میں داخل ہوتا تو کمرے میں کھڑے ہو کر وہ جائزہ ضرور لیتا۔ ''یہ کیا پڑا ہے؟ کیا آج جھاڑو نہیں لگایا؟ فرنیچر پر گرد کتنی ہے۔ سارا دن گھر میں کیا کرتی ہو؟'' وہ بیزاری سے مہر النساء سے پوچھتا۔ ''کام ہی کرتی ہوں''۔ وہ زچ ہو کر جواب دیتی۔ ''نظر تو نہیں آ رہا کوئی کام''۔ وہ طنزاً جواب دیتا اور مہر النساء خاموش ہو جاتی۔ بحث کرنے کی اُس کی عادت نہیں تھی۔ پھر پھوپھی کی گرتی صحت مہر النساء کو اُن کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اپنی امی کو وہ مہینوں نہ مل سکتی تھی۔ ابو اور بہن بھائی سب یاد آتے۔ شہروں کا سفر اتنا زیادہ نہ تھا۔ امی ابو ملتان میں تھے اور سسرال جھنگ میں۔ مگر وہ سال میں صرف دو بار امی ابو کو مل سکی۔ ہر وقت خیالوں میں گھر والے چھائے رہتے۔ امی کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے، اپنی امی کی خوشبو ہی ہر وقت اُس کے حواسوں پر چھائی رہتی۔ چھوٹی بہن جو چھ برس کی تھی اُس کی معصوم باتیں یاد کر کے مہر النساء کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔

''یہ کیا ہر وقت ٹسوے بہاتی رہتی ہو''۔ وہ جھنجھلا کر بولتا تب مہر النساء کو اُس کی آواز زہر لگتی اور پھر اُس کے زہریلے جملے دھیرے دھیرے اُس کے دل میں سجاد کے لیے بیزاری پیدا کرتے چلے گئے۔

وہ اپنے شوہر سے کھچی کھچی رہنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ جب بھی وہ اُس کے سامنے جاتی ہے تو وہ کوئی طنز ہی کرتا ہے۔ زیادہ وقت اُس کا اپنی پھوپھی کے ساتھ گزرتا۔ اُن کو بھی بلڈ پریشر کی شکایت لاحق ہوگئی اور غصہ بھی تیز ہوتا چلا گیا۔ اُن کی دوست جو پڑوس میں رہتی تھی اکثر آ جایا کرتی۔ ایک دن وہ ملاقات کے لیے آئی۔ ''ارے کیا ہو گیا تم بستر پر دراز ہو؟'' انھوں نے مہر النساء کی ساس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''ارے موا بلڈ پریشر میرے گلے پڑ گیا ہے''۔ اچھا یہ موذی بلا تمہارے سر پر بھی سوار ہوگئی۔ میرے شوہر کو پچھلے سات آٹھ برس سے اس بیماری نے جکڑا ہوا ہے۔ بلڈ پریشر کے مریض کی بیمار پُرسی کرنے کے بجائے اُس کے گھر والوں کی مزاج پُرسی کرنی چاہیے کہ اُن کا کیا حال ہے؟'' ''اب اتنا بُرا حال بھی نہیں ہوا''۔ پھوپھی بُرا مان گئیں۔ ''ارے میں مذاق کر رہی تھی''۔ مہر النساء کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھی اور دونوں دوستوں کی نوک جھونک سن کر مسکرائے جا رہی تھی۔

''یہاں کھڑی کیا دانت نکالے جا رہی ہو مجھے دو بجے کچہری جانا ہے، جو کچھ ہے لے آؤ''۔ سجاد نجانے کب گھر میں داخل ہوا۔ اُسے احساس بھی نہ ہوا جلدی سے کھانا دے کر وہ باہر آ گئی۔ اُس کو جاتے دیکھ کر مہر النساء نے سکھ کا سانس لیا۔ ''چلو جان چھوٹی اب رات گئے ہی آئے گا''۔ اب سجاد کا وجود اُس کے لیے ایک عذاب بن چکا تھا۔ جب تک وہ گھر میں رہتا مہر النساء کے دل و دماغ ایک عجیب سی گھٹن محسوس کرتے۔ جیسے ہی وہ گھر سے باہر نکلتا مہر النساء کو ایسا محسوس ہوتا کہ اُس کے وجود پر سے ایک بھاری بوجھ کسی نے اُتار ڈالا ہو۔

وقت کا پنچھی اُڑتا چلا گیا۔ دو سال بعد مہر النساء کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اُسے جیسے اپنی تنہائیوں کا ساتھی مل گیا۔ وہ پہروں اُس سے باتیں کرتی چلی جاتی اور مُنا ریحان بڑی بڑی آنکھوں سے اُسے دھیان سے دیکھتا جیسے اُس کی باتیں سمجھ رہا ہو۔ چار سال بعد ایک اور مہمان آ گیا۔ پھر دو بیٹیاں پیدا

ہوئیں۔مہرالنساء کو اب اپنے بچوں کا ساتھ مل گیا۔وہ اُن کے ساتھ کھلکھلا کر اُن کی ہر بات کا جواب دیتی۔مہرالنساء کی ساس اللہ کو پیاری ہوگئیں۔سجاد کی ٹرانسفر رحیم یار خان ہوگئی۔کبھی چھ ماہ بعد چند دن کی چھٹی پر وہ آ جاتا۔بچوں کے لیے بھی اُس کے پاس وقت نہ تھا۔

یہ دو چار دن مہرالنساء دعائیں مانگ مانگ کر گزارتی کہ سجاد کو کہیں غصے کا دورہ نہ پڑے۔وہ کم سے کم بات کرتی اور کوشش یہی کرتی کہ اُس کا سامنا ہی نہ ہو۔کبھی بھی اُس کے دل میں سجاد سے بات کرنے کی خواہش نہ جاگی۔وہ کبھی قریب ہوتا بھی تو مہرالنساء کی نظریں گھڑی پر ہوتیں کہ وہ کب اُٹھ کر باہر جائے گا۔اجنبیت کی دیوار وقت کے ساتھ ساتھ اُونچی ہوتی چلی گئی۔وہ کبھی کوشش بھی کرتی کہ اپنے شوہر سے کوئی بات کرے تو اُسے کوئی موضوع ہی نہ ملتا اور پھر شوہر کے ماتھے پر پڑے بل دیکھ کر نجانے کیوں بات کرنے کا ارمان خود ہی سرد پڑ جاتا۔

زندگی اِسی ڈگر پر چل رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے بچے جوان ہوگئے۔وہ بچپنا جو مہرالنساء نے جی بھر کر دیکھا نہ تھا۔بچوں کے بچپن کے ساتھ جیسے دوبارہ آ گیا ہو اور اب جب کہ وہ جوان ہوگئے تو ایسے جیسے مہرالنساء پر جوانی آ گئی ہو۔ریحان نے جب دسویں کے امتحان کی تیاری شروع کی تو مہرالنساء بھی کتابیں لے کر اُس کے ساتھ بیٹھ گئی اور دسویں کا امتحان دے ڈالا۔تین ماہ بعد جب رزلٹ آیا تو اُس نے میٹرک سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لی۔ریحان جس کی فرسٹ ڈویژن آئی تھی اپنے رزلٹ سے زیادہ اپنی امی کے پاس ہونے پر خوش تھا۔

''مجھے ڈر تھا کہ آپ کہیں فیل ہوگئیں تو مایوس ہو کر پڑھائی چھوڑ نہ دیں''۔مہرالنساء ہنس پڑی۔''کیا مطلب ہے تمہارا چھوڑ نہ دیں میں کون سا کالج جانے والی ہوں؟''

ریحان نے امی کا ہاتھ تھام لیا۔''آپ کالج نہ جائیں ہم پہلے کی طرح اکٹھے تیاری کریں گے۔مَیں جو کچھ پڑھوں گا آ کر آپ کو سکھا دیا کروں گا''۔ریحان نے اپنی امی کی ہمت بڑھائی۔

وہ جو دبی چنگاری تھی ذرا سی راکھ ہونے کے بعد دوبارہ شعلہ بن گئی۔گلی کے نکڑ پر ایک ٹیوشن اکیڈمی تھی مہرالنساء نے وہاں انگلش کی ٹیوشن پڑھنی شروع کر دی اور باقی مضامین تاریخ اسلامیات اور پولیٹیکل سائنس خود سے ہی پڑھنے لگی۔انگلش میں ریحان بھی مدد کرتا۔گو کہ وہ پری انجینئرنگ کے مضامین پڑھ رہا تھا،وہ پولیٹیکل سائنس،تاریخ اور اسلامیات پڑھانے میں بھی پیش پیش تھا۔دونوں بیٹیوں رِدا اور زارا نے گھر کے کام کاج میں مدد کی۔ریحان سے چھوٹے بیٹے کامران نے بھی گھر کے کام کاج اور باہر سے سودے کی خریداری میں ہاتھ بٹایا۔

''مجھے ایسے لگتا ہے میں تم لوگوں کے ساتھ دوبارہ جوان ہوگئی ہوں۔اپنی جوانی کا تو پتا ہی نہیں چلا کب آئی اور کب چلی گئی!''

رِدا نے اپنی امی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔''چلی کدھر گئی۔جوانی تو آپ پر اب آئی ہے''۔

مہرالنساء ہنس پڑی۔''دل کو بہلانے کے لیے خیال اچھا ہے''۔

پھر ایف اے بھی سیکنڈ ڈویژن پاس ہوگئی۔''اب پڑھائی کر کے کیا تیر مارنا ہے؟''حسبِ معمول سجاد نے ترکش سے تیر چھوڑ دیا۔

مہرالنساء ہر طنز کو نظرانداز کرتی رہی جس شخص نے اُس سے بچپن چھینا،جوانی کی بہاروں میں خزاؤں کا رنگ بھر دیا وہ کبھی بھی اُس کے طنزوں پر اتنی نہیں بِلکی جتنی اپنی محنت سے حاصل کیے نمبروں پر اُس کی جلی بُھنی باتوں پر بِلک بِلک کر روئی۔کرسی پر بیٹھی وہ سسک رہی تھی اور آنسو جھولی میں گرتے جا رہے تھے۔

''ہمیں تو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ روتی ہوئی عورت پر کبھی بھی اعتبار نہ کرو۔ایسا میں نے کیا کہہ دیا جو تم نے اتنا طوفان اُٹھا دیا ہے؟''مہرالنساء خاموش رہی۔

''میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں؟''سجاد کی آواز میں تیزی آ گئی۔

مہرالنساء اُٹھ کر صحن میں آ گئی۔ سجاد دو دن رہ کر واپس ڈیوٹی پر چلا گیا۔ آج تو وہ جیسے بالکل اُس کے دل سے اُتر گیا۔ اُس کی آواز بھی اب مہرالنساء کو برداشت نہ ہوتی تھی۔ رحیم یار خان پہنچ کر اُس نے فون پر ریحان اور کامران سے بات کی۔ مہرالنساء سے بات نہ کی۔ نہ ہی مہرالنساء نے اُن سے پوچھا کہ اُن کے باپ نے فون پر کیا بات کی۔ ریحان انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور چلا گیا۔ مہرالنساء اُداس ہوگئی۔ ریحان ہی سے وہ دل کی ہر بات کرتی تھی۔ اُسی نے ہمیشہ اُس کے بہتے آنسو پونچھے تھے۔ اُس کے چلے جانے سے ایک خلاء سا پیدا ہوگیا۔ مگر جاتے جاتے وہ ایک وعدہ اپنی ماں سے لے کر گیا۔

''آپ آئندہ بی اے کی تیاری بھی کریں گی''۔

''ارے بی اے مشکل ہے، میٹرک، ایف اے ہی ٹھیک ہے''۔

''امی آپ بی اے بھی کر سکتی ہیں''۔

''چلو کوشش کر کے دیکھوں گی''۔

''کوشش نہیں آپ بی اے پاس کریں گی۔ اگر آپ نہ کر سکیں تو شاید میں انجینئرنگ بھی نہ کر سکوں''۔

''نہیں میرے بیٹے، ایسا نہ کہو۔ تمھارا دماغ تازہ ہے ہر چیز سیکھ سکتے ہو، یاد رکھ سکتے ہو۔ میں تو سب کچھ یاد نہیں کر سکتی''۔

''یہ بات آپ کے ذہن میں ہے جتنا دماغ کو استعمال کریں گی اتنا ہی یہ کام کرے گا۔ جیسے کسی دھات کو مسلسل رگڑنے سے چمک آتی ہے''۔

پھر اُسے اپنے بیٹے کے سامنے وعدہ کرتے ہی بنی۔ پڑھائی مشکل تھی مگر ایک شوق، ایک بیٹے سے کیا گیا وعدہ، وہ لگی رہی۔ راتوں کو جاگ کر، دن میں پڑھ کر، تاریخ کے واقعات پڑھتے اب اُسے مزہ آنے لگا۔ پولیٹیکل سائنس کو وہ ٹی وی پر میڈیا کے شوز دیکھ کر، اخباروں کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرتی۔ بیٹیوں کو جو ٹیچر پڑھانے آتی تھی، اُس نے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کر رکھا تھا۔ مہرالنساء نے خود کو بھی ٹیوشن میں شامل کرلیا اور انگلش کی ٹیوشن ساتھ والی اکیڈمی سے چلتی رہی۔ اسی دوران سجاد ریٹائرڈ ہو کر گھر آ گیا۔ اپنے ساتھ وہ ریٹائرمنٹ کی پریشانیوں کے ساتھ بڑھتا ہوا چڑچڑاپن بھی لے کر آیا۔

''تمھیں جب بیاہ کر لایا تھا تو سکول گرل تھیں اور اب پچیس برس گزر جانے کے بعد بھی سکول گرل ہی ہو۔ نہ اُس وقت کچھ بدلا اور نہ آج۔''

اُس کے لہجے میں ہمیشہ سے بھی زیادہ زہر بھرا تھا۔ مہرالنساء نے کتاب پر سے نظریں نہ ہٹائیں۔ وہ پڑھتی اور پھر لکھتی جاتی اور لکھتی ہی چلی جاتی جیسے اپنے دل کی ساری بے چینی کو وہ سفید کاغذوں پر بکھیر دینا چاہتی تھی۔ اپنی محرومیوں کو وہ قلم کی نوک پر رکھ کر ہوا میں پھیلا دینا چاہتی تھی۔ سجاد کا وجود اُس کے لیے جیسے تھا ہی نہیں وہ سامنے کھڑا اُسے نظر نہ آتا تھا۔

''امی جی! آپ نے اپنی موت سے ڈر کر اس فرعون کے گلے مجھے باندھ دیا۔ میری شادی کے پندرہ برس بعد تک آپ جیتی رہیں۔ سب بچوں کی شادیاں کر کے رخصت ہوئیں۔ اگر میری باری بھی صبر کر لیتیں تو شاید کوئی میرا ہم عمر ساتھی مجھے مل جاتا جو میرے ساتھ ہنستا اور میرے ساتھ روتا۔ میرا دکھ سمجھتا''۔

وہ اپنی ماں سے باتیں کرتی رہی۔ خشک آنکھوں سے خلاؤں میں گھورتی رہی۔ اب آنسو بھی خشک ہو چلے تھے۔ تین سال بعد ریحان یونیورسٹی سے گھر آیا تو مہرالنساء اپنا رزلٹ کارڈ لیے اُس کے سامنے کھڑی تھی۔

''امی! آپ نے تو بی اے میں فرسٹ ڈویژن لی ہے!'' وہ خوشی سے چیخ پڑا۔

''کیسے نہ لیتی؟ تم سے وعدہ جو کر رکھا تھا''۔ مہرالنساء نے اپنے بیٹے کو گلے سے لگالیا۔

اکیلے میں اپنے ابو کی تصویر کو سینے سے لگا کر نجانے کتنے عرصے بعد سسک کر روئی۔ ''ابا جی! آپ مجھے پڑھانا چاہتے تھے مگر امی کے کہنے میں آ کر

آپ نے میری شادی کردی۔ دیکھئے آج میرے بچوں نے مل کر مجھے پڑھایا ہے''۔

'ننھی پری' مہر النساء کے ابا ہمیشہ اُسے اِسی نام سے پکارتے تھے۔ یہاں تک کہ جب اُس کی شادی ہونے کو تھی تو تب بھی اُسے ننھی پری ہی کہتے رہے۔ ''مجھے پانی پلا دو میری پری''۔ ''ذرا میرا چشمہ تو لا دو میری ننھی پری''۔ یہ نام اپنے ابا جی کی زبان سے مہر النساء کو بہت اچھا لگتا اور جب شادی کر کے سسرال آئی تو ایسے لگا جیسے اماں باوا کا گھر واقعی پرستان ہی تھا اور پرستان سے نکل کر وہ بیابان وصحرا میں آ گئی ہو جہاں نہ سایا تھا نہ ہی پیاس بجھانے کو کوئی چشمہ تھا۔ سسرال والوں کی نظریں اپنے والدین سے کتنی مختلف تھیں۔ ہر وقت گھورتی، شعلے برساتی نظریں وہ تو جیسے چند دنوں میں ہی جھلس کر رہ گئی۔ 'کاش سسرال والے بھی عورت کو اُسی آنکھ سے دیکھیں جس آنکھ سے ماں باپ دیکھتے ہیں تو دنیا جنت بن جائے!' وہ حسرت سے سوچا کرتی۔

علم کی شمع ہاتھ میں آئی تو ساتھ ہی سوچ کی گہرائی میں اضافہ ہوتا گیا۔ صبر کی لا متناہی دولت بھی حاصل ہوگئی۔ وہ جیسے اپنے آپ سے مطمئن ہوگئی۔ شب وروز ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے۔ سب بچے پڑھائی کے دَور سے گزر رہے تھے۔ پڑھائی جس کے لیے اچھی خاصی رقم درکار ہوتی ہے۔ سجاد کو ریٹائر ہوئے بھی دو برس بیت چکے تھے۔ جمع پونجی بھی بچوں کی پڑھائی کی نذر ہوگئی۔ ریحان انجینئر بن تو چکا تھا مگر ابھی نوکری کی تلاش میں تھا جو کہ پڑھائی سے بھی مشکل مرحلہ تھا۔ صرف سجاد کی پنشن اِن اخراجات کے لیے کافی نہ تھی۔

پھر مہر النساء نے ایک فیصلہ کیا نوکری کرنے کا۔ گھر کے اخراجات پورے کرنے تھے اور ابھی تو پڑھائی کے بعد بچوں کی شادیوں کا مرحلہ تھا۔ وہ بھی کمر توڑنے کے برابر ہی تھا۔ اپنے میاں کا ہاتھ بٹانے کے لیے مہر النساء نے نوکری کا فیصلہ کرلیا۔ ''آخر میں نے جو محنت کر کے تعلیم حاصل کی ہے اُس کا یہ فائدہ بھی تو ہوسکتا ہے''۔ اس نے سوچا اور پھر جس اکیڈمی میں سے ٹیوشن حاصل کی وہیں نوکری کی درخواست دے دی۔ نویں دسویں کے بچوں کو انگلش پڑھانے کی اور نوکری مل گئی۔ دو گھنٹے کے لیے وہ جاتی، پڑھا کر واپس آتی اور پھر ایسی ہی ٹیوشن اکیڈمی جو ذرا گھر سے دُور تھی وہاں دو گھنٹے اور پڑھانے لگی۔ آمدنی تھوڑی اور بڑھ گئی۔

سجاد نے پہلے تو اُس کے گھر سے باہر نکلنے کی بڑی مخالفت کی مگر کچھ سوچنے کے بعد وہ بھی رضامند ہوگیا۔ شام کے وقت چار گھنٹے گھر سے باہر چلے جانا شروع میں تو مشکل لگا مگر رِدا اور زارا نے بھی اپنی ماں کا ساتھ دیا۔ مہر النساء دن کے وقت گھر کے کام نبٹا لیتی اور کوشش کرتی کہ رِدا اور زارا کو زیادہ محنت نہ کرنی پڑے وہ بھی پڑھائی میں مصروف تھیں کہیں اُن کی پڑھائی میں حرج نہ ہو۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔ ریحان کو ملازمت مل گئی۔ گھر میں آمدنی کا اضافہ ہوگیا۔ دوسرا بیٹا کاشف بھی اپنی پڑھائی مکمل کر کے روزگار کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا۔ رِدا نے کمپیوٹر سائنس میں ایم ایس سی کر لی اور زارا ایم ایس سی کے آخری سال میں پہنچ گئی تھی۔ پڑھائی اور اُس سے جڑے کمر توڑ اخراجات کے شکنجے سے مہر النساء اور سجاد باہر آ گئے تھے مگر اخراجات کا اگلا مرحلہ بچوں کی شادیاں تھا۔ مہر النساء نے ٹیوشن کے اوقات بڑھا دیئے۔ محنت کرنا اب ایک بوجھ نہیں بلکہ ایک معمول بن گیا۔ اُس کے بچوں نے بھی محنت کی عادت کو گلے سے لگا لیا کہ اِسی میں عزت تھی اور محنت نے ہی اُن سب کو اپنے قدموں پر دوبارہ کھڑا ہونے کی طاقت عطا کی تھی۔ سب گھر والے جب کمر کس کر حالات سے لڑنے کو کھڑے تھے تو سجاد نے بھی اپنی بکھری ہمت کی تانیں اکٹھا کیں اور ملازمت کی تلاش میں نکل پڑا۔

ایک ریٹائرڈ پولیس آفیسر کو دوبارہ ملازمت ملنا اتنا آسان نہ تھا۔ وہ ہر روز گھر سے نکلتا، اخباروں کے اشتہارات پر اپنے احباب کے بتلائے ہوئے ٹھکانوں پر مگر کامیابی کہیں نظر نہ آتی۔ ''دل چھوٹا نہ کریں ان شاءاللہ ایک دن کامیابی مل جائے گی''۔ مہر النساء نے سجاد کی ہمت بڑھائی وہ اس مشکل مرحلے پر ہر ممکن اُس کی دلجوئی کرتی۔ سجاد کا چڑ چڑا پن ویسے کا ویسا ہی تھا مگر مہر النساء اب کڑھتی نہ تھی بلکہ اُسے سجاد سے ہمدردی محسوس ہوتی۔

''یہی تو ہے جس نے ہم سب کو اپنی جوانی میں کما کر کھلایا ہے، بچوں کو اور مجھے بھی پڑھایا ہے''۔

پھر ایک دن سجاد مسکراتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ بڑے عرصے کے بعد اُس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر مہر النساء بھی کھل اُٹھی۔

''مجھے ایک بڑی شاپنگ مال کے سیکورٹی سسٹم میں نوکری مل گئی ہے''۔

یہ ایسی خبر تھی کہ سارے گھر میں ہی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اپنی ملازمت کی پہلی صبح جب وہ پورے چھ سال کے بعد واپس وردی میں ملازمت پر جارہا تھا تو مہر النساء نے اُس کے لیے ناشتہ بنایا اور جب رخصت کرنے دروازے تک آئی تو سجاد نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

''سکول گرل، تمہارے بابا تمہیں ننھی پری کہتے تھے۔ اب ننھی تو نہیں مگر پری تو ہو جس نے میرے گھر کو پرستان بنادیا ہے۔ میری کُل کائنات کو سنوار دیا ہے۔ تمہارا شکریہ''۔

''اچھا؟'' مہر النساء کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''تم ایسا سوچتے ہو مجھے تو ایسا لگا کہ تمہیں پرواہ ہی نہیں''۔

سجاد ہنس دیا۔ ''مجھے پروا اور احساس دونوں تھے۔ جب تم امی کی خدمت کرتی تھیں، میرے بچوں کو پالتی تھیں...... بس منہ سے تشکر کے الفاظ نہیں نکلتے تھے مگر آج میں تہہ دل سے تمہارا شکر گزار ہوں اور اِس کا اظہار بھی کر رہا ہوں''۔

مہر النساء کو لگا جیسے تپتے صحرا سے نکل کر ٹھنڈی چھاؤں میں آن بیٹھی ہوں۔ ایسے جیسے مزدور کو اُس کی مزدوری توقع سے بھی زیادہ مل گئی۔ وہ آج دل کی گہرائیوں سے مسکرائی۔ پھولوں جیسی ٹھنڈی مہکتی مسکراہٹ سے اُس کا چہرہ دمک اُٹھا۔

☆☆☆

پہلا حصہ

شجرِ بے ثمر

نصرت یوسف

ناشتے کے لیے آملیٹ بناتے ہوئے اس نے دوسرے چولہے پر چائے کا پانی رکھا جو کچھ دیر میں ابل گیا تو اس نے چائے تیار کر کے مگوں میں انڈیل لی۔ میاں اور بچے سب کے ہی گھر سے نکلنے کا ایک ہی وقت اور ایک اکیلی وہ جو پھرکی کی طرح یہاں سے وہاں گھومتی ہوئی ان سب کی فکر کر رہی تھی۔

روز ہی کا یہ منظر ہوتا تھا۔ محفوظہ کے لیے یہ سب کام کسی کوفت یا بیزاری کا سبب قطعاً نہیں تھے۔ وہ یہ سب اپنی ذمہ داری سمجھ کر خوشی خوشی کرتی تھی کیونکہ وہ محبت کرنے والی ماں تھی، بیوی تھی۔

بچے تو خیر اس کے بہت محبت کرتے تھے۔ میاں کا البتہ وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی کہ آیا وہ اس سے محبت کرتا ہے یا محض رشتہ نبھا رہا ہے۔ کیونکہ کبھی اس نے کسی الفت کا مظاہرہ کیا ہی نہیں۔ نہ بول کر نہ بنا بولے۔ چھوٹا موٹا کام پرچون کا کرتا تھا جس سے گھر کا خرچ پوری طرح نہ چل پاتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی ہنر مندی مصنوعی زیورات میں دکھاتی۔ اس کے پاس قدرتی ہنر تھا، معمولی چیزوں کو بھی حسن بخش دیا کرتی تھی۔ اور پھر یہ زیورات اس کے جان پہچان والوں میں اچھی قیمت پر فروخت ہو جایا کرتے تھے۔ یوں وہ کبھی تنگی کا شکار نہیں ہوئی۔ بلکہ سب ہی گھر والے جن میں اس کے تینوں بچے، دو بیٹیاں اور بیٹا اور اس کا شوہر رشید بیگ اچھا کھاتے، پیتے، پہنتے اور مناسب انداز میں خرچ کر لیا کرتے تھے۔

بڑی بیٹی کالج بس سے جاتی تھی، دونوں چھوٹوں کو رشید بیگ گاڑی میں اسکول چھوڑ کر گاڑی گھر پر چھوڑ جایا کرتا تھا۔ گاڑی کچھ عرصہ قبل محفوظہ نے کمیٹی نکلنے پر خریدی تھی۔ سیکنڈ ہینڈ تھی، حالت کچھ خاص نہ تھی، بہر حال انجن ٹھیک تھا، تنگ نہ کرتی تھی۔ پڑوسی نے خوب عرصہ کام لینے کے بعد بیچی تو اس نے خرید لی۔ ادائیگی میں بھی اس نے خاصی سہولت لی تھی۔ نصف کی ادائیگی کر کے اس نے گاڑی کا قبضہ لے لیا تھا۔ بقیہ نصف کچھ عرصہ بعد ادا کرنا تھا جس کے بارے میں وہ پر امید ہی تھی کہ جلد ہو جائے گی۔ رشید بیگ نے اسے اشارہ دیا تھا کہ نصف رقم کے لیے وہ تردد نہ کرے، وہ خود کچھ بندوبست کر لے گا۔ کہاں سے، کیسے، یہ محفوظہ نے سوچا ہی نہیں کہ اس کے پاس اور بہت ذمہ داریاں تھیں جن پر سوچ بچار اس نے ہی کرنا ہوتا تھا۔

رشید بیگ نے بیوی کے اٹھائے معاشی بوجھ پر کبھی کوئی تاثر نہ ظاہر کیا تھا۔ نہ اچھا کہا نہ غلط کہا، بس فیض یاب ہوتا رہا۔ وقت پر دکان جاتا، وقت پر واپس۔ نہ یار دوست، نہ کوئی اور مشاغل......بس گھر آ کر ٹی وی کا ریموٹ سنبھال لیتا۔ بس پھر وہ ہوتا اور رنگ برنگے پروگرام۔ ضرورت کے تحت محفوظہ سے کوئی ایک آدھ بات ہو جاتی۔ ورنہ وہ اپنے کام میں مصروف اور یہ ٹی وی میں۔ بچے اور باپ کا تعلق بھی کوئی خاص نہ تھا۔ اگر وہ کبھی ان کے لیے کچھ لے کر بھی آتا تو محفوظہ ہی کا کام تھا کہ وہ بچوں کے حوالے کرے۔ اسے خود کبھی کوئی چاؤ نہیں آیا کہ وہ بچوں کے ساتھ کوئی تعلق بنائے......لگاوٹ کا، محبت کا، انسیت کا۔ سو بچے بھی اس سے فاصلے پر ہی رہتے تھے۔ بس سب سے چھوٹا ہی تھا جو باپ سے خود چمٹتا تھا۔ ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا۔ ایسا محفوظہ کرتی تو ہوں ہاں سے زیادہ جواب نہ ملتا لیکن اولاد کو رشید بیگ التفات کی نظر ڈال ہی لیتا۔ حالانکہ وہ پورا ماں کی شکل تھا، لگتا تھا جیسے محفوظہ کے چہرے پر مردانہ چھاپ۔

محفوظہ کا کام بھی دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا، اس کی بنائی جیولری کی مانگ خاصی ہوتی جا رہی تھی۔ قیمت بھی اچھی ملنے لگی تھی۔ رشید بیگ نے اس عرصے میں کچھ ترقی نہ کی تھی محفوظہ کے اچھے کام نے اس کو خاصا بے فکر کر دیا تھا۔ سو کمانے کے لیے وہ کچھ زیادہ ہاتھ پیر نہیں مارتا تھا۔ لگا بندھا طریقہ، لگا بندھا انداز اور لگے بندھے گاہک، وہ بھی اب کچھ کم ہو گئے تھے کیونکہ جگہ جگہ سپر اسٹورز نے گاہک کو ان چھوٹی موٹی دکانوں کی جانب سے ہٹا دیا تھا۔ گاہک ایک جگہ جا کر زیادہ خریداری کرنے میں آسانی اور دلچسپی محسوس کرنے لگا تھا جو چھوٹی سی ایک پرچون کی دکان میں کہاں۔ نہ صاف ستھرا چمکتا دمکتا ماحول اور نہ قسم قسم کی ورائٹی، ایک چیز لینے جاؤ تو دس چیزوں کے ساتھ لدے پھندے واپس آؤ۔ اب چاہے کریڈٹ کارڈ کا استعمال ہی کرنا پڑ جائے لیکن اس رنگ برنگی دنیا کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے جسے چھوڑ کر گاہک چھوٹی موٹی دکانوں پر نہیں جانا چاہتا۔ اس لیے رشید بیگ کی دکانداری بھی ماند پڑتی جا رہی تھی جس نے اسے بھی آخر فکرمند کر ہی دیا۔

گاڑی کی رقم بھی ادا کرنی تھی جبکہ اس مہینہ آمدنی ہی خاصی کم تھی۔ بجائے کوئی ترکیب سوچنے کے اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

وہ تو محفوظہ اس وقت چونکی جب بچوں کے اسکول سے فیس کا نوٹس آیا۔ اسے حیرت تھی کہ رشید بیگ نے اس ماہ کی فیس کیوں نہیں جمع کرائی۔ عموماً وہ دس تاریخ سے قبل خود ہی فیس جمع کرا دیا کرتا تھا۔ اس نے فکرمندی سے نوٹس کو پڑھا اور پھر رشید بیگ کے گھر آنے کے بعد موقع دیکھ کر اس سے بات کی تو وہ محض اس کی شکل دیکھ کر دوبارہ ٹی وی میں مشغول ہو گیا۔ محفوظہ نے جھنجھلا کر اس کی دلچسپی کے سین کو دیکھا جہاں کوئی گلوکارہ انتہائی واہیات لباس میں جسم کی حرکات وسکنات دکھا کر انگریزی گانا گا رہی تھی۔ رشید بیگ کا کام پرچون کا تھا لیکن انگریزی سے نابلد نہیں تھا۔ یہ تو محفوظہ کو اچھی طرح علم تھا لیکن جس انداز اور لہجے میں وہ گا رہی تھی، محفوظہ کو یقین تھا کہ رشید بیگ کو اس کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آ رہا ہوگا۔ سمجھ آ رہا تھا تو محض اس کا حلیہ جسے دیکھ کر اس نے بے اختیار استغفر اللہ پڑھا۔

’’میں کہہ رہی ہوں کہ فیس کیوں ادا نہیں کی؟‘‘

’’کیونکہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔‘‘ اس نے ٹی وی سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔

ایک جملے کا جواب دے کر وہ پھر خاموش تھا۔ محفوظہ کو خاصہ غصہ اس کے جواب پر آیا لیکن وہ کچھ بھی کہے بنا وہاں سے لوٹ گئی۔ مزید سوال بیکار تھا۔ اسے اصل بات پتہ چلنے کی کوئی امید نہ تھی کہ پیسے نہ ہونے کی کیا وجہ ہے۔ یقیناً آمدنی میں فرق پڑا ہوگا، اس نے سوچا مگر یہ خیال بھی خاصا فکرمند کر دینے والا تھا کہ اب فیس کے پیسے بھی رشید بیگ کے بجائے اس کو ادا کرنے ہوں گے جو کہ بذاتِ خود بڑا خرچہ ہے۔ بہرحال بچوں کو تو فیس ادا کرنی ہی تھی، سو اس نے اگلے ہی دن اپنے پاس تازہ تازہ آئے پیسوں سے اس کی ادائیگی کی جو اس نے کچن کو ٹھیک ٹھاک کرانے کے لیے رکھے تھے۔ یہ پیسے نکالتے وقت اس کا دل بہت ناخوش تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

رشید بیگ نے تو جیسے اپنے آپ کو محفوظہ کو جواب دینے کے بعد ہر بات سے بری الذمہ قرار دے لیا تھا۔ اس نے پلٹ کر بھی نہ پوچھا کہ آخر بچوں کی فیس کی ادائیگی محفوظہ نے کہاں سے اور کیوں کر کی۔ اس سے پھر کوئی سوال نہ ہوا نہ اس نے کچھ پوچھا۔ پرچون کی دکان کی آمدنی گرتی دیکھ کر وہ فکرمند ہونا شروع ہوا تھا لیکن فیس کی ذمہ داری سے جان چھڑاتے ہی اسے اس کی بھی پروا نہیں رہی۔

کالج جانے والی بیٹی ربیعہ کا رشتہ آیا ہوا تھا۔ محفوظہ اور رشید بیگ دونوں کو ہر لحاظ سے یہ مناسب ترین لگا تھا، لڑکا اچھا کما تا کھاتا تھا۔ ربیعہ کے ساتھ اس کی بہن پڑھتی تھی جس نے اپنے بھائی کے لیے ربیعہ کو پسند کیا تھا۔ رشتہ طے کرنے کے بعد پہلی سوچ اخراجات کی ہی ذہن میں ابھرتی ہے۔ محفوظہ بھی رشید بیگ سے اس معاملے پر گفتگو کا سوچ رہی تھی کہ ایک دن اس نے خود ہی یہ موضوع چھیڑ دیا۔

’’ہاں تو کیا ارادہ ہے شادی کا؟‘‘ ریموٹ سے ٹی وی آف کر کے اس نے محفوظہ کو قریب سے گزرتے دیکھ کر پوچھا تو وہ کپڑے باہر الگنی سے اتار کر لاتی ہوئی رک گئی۔ کپڑوں کے ڈھیر کو صوفہ پر ایک جانب رکھتے ہوئے اس نے اپنے بیٹھنے کو جگہ بنائی۔

’’آپ بتائیے، کیا کرنا چاہیے۔ اخراجات تو خاصے ہیں جو کرنے ہیں، گاڑی کی رقم بھی واجب الادا ہے اس کا بھی آپ نے کچھ نہیں کیا۔‘‘ اس نے لگے ہاتھوں میاں کو گاڑی بھی یاد دلا دی جس کا تقاضا کل ہی اس کے پاس آ گیا تھا۔ پڑوسی بھی بہت شریف آدمی تھا۔ بڑے صبر سے بیٹھا تھا۔ وہ ان لوگوں کے طرزِ زندگی سے خوب واقف تھا کہ محفوظہ اور رشید بیگ کا ساتھ کس قسم کا ہے۔ اس کی بیوی ان کے حالات زندگی کا مشاہدہ کر کے میاں سے ذکر کرتی رہتی تھی۔ جس کا لب لباب یہ ہی ہوتا تھا کہ ’محفوظہ جیسی ہیرا عورت بڑے ناقدرے کے ساتھ گزارا کر رہی ہے۔‘

رشید بیگ نے محفوظہ کی گاڑی کی بات سن کر ایسے بھنوؤں کو اچکایا جیسے وہ یہ سب بھول چکا ہو کہ کبھی اس نے ایسا کوئی وعدہ کیا تھا۔

’’گاڑی کو چھوڑو، شادی کی فکر کرو، اسے تو اخراجات کے لیے بیچنا ہی پڑے گا۔‘‘ بڑی سہولت سے یہ بات کہہ کر اس نے محفوظہ کے رکھے کپڑوں سے اپنی بنیان اٹھائی اور باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔ محفوظہ نے بھونچکا ہو کر اس کی بات سنی اور باتھ روم کے بند دروازے کو دیکھنے لگی جہاں وہ غائب ہوا تھا۔

گاڑی بیچنے کا نام سن کر اسے دکھ پہنچا تھا۔ اس نے کتنے ارمانوں سے یہ گاڑی خریدی تھی۔ فیض بھی اس کا زیادہ تر رشید بیگ نے اٹھایا تھا۔ پہلے وہ بچوں کو اپنی بائیک پر اسکول چھوڑنے جاتا تھا، اب گاڑی آنے کے بعد سے گاڑی کا سفر اسے آرام دہ لگتا تھا۔ گو بچوں کو کوئی اعتراض بائیک پر بھی نہیں تھا لیکن یہ اس کی اپنی پسند تھی۔ پوری فیملی کبھی کبھار گھومنے گاڑی میں چلی جایا کرتی۔ ایندھن بھی خاصا مہنگا تھا، سو اس کی بچت کے لیے بھی وہ گاڑی کا استعمال کم سے کم کر کے بائیک کے سفر کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ اب اسی گاڑی کو سال بھر بعد رشید بیگ بیچنے کا کہہ رہا تھا۔ اس نے ڈھیر ہوئے کپڑوں کے گٹھڑ کو دیکھا اور ڈھیلے ہاتھوں سے ایک کے بعد ایک اٹھا کر ان کو تہہ لگانے لگی۔

رشید بیگ گاڑی بیچنے کا کہہ کر گویا نسخہ اخراجات ادا کرنے کا اپنے طور پر بتا کر مطمئن ہو گئے۔ لیکن محفوظہ بے چین ہو گئی اور پھر وہی ہوا کہ گاڑی بک گئی۔ ایک طرح سے بہتر یہ ہوا کہ نصف رقم کی ادائیگی جو باقی تھی وہ اس قرض سے آزاد ہو گئی۔ باقی سے اس نے تیاریاں شروع کر دیں۔

لیکن ایک پرانی گاڑی کی نصف رقم یقیناً اتنی ہرگز نہ تھی کہ کلی طور پر اس پر انحصار کر لیا جاتا۔ رشید بیگ سے کچھ کہنا بیکار تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ پھر بطور باپ اس نے ایک بڑا قدم یہ اٹھایا کہ اپنی دکان کا کچھ حصہ بیچ دیا۔ اچھی رقم ملی اور اخراجات کافی اس میں نمٹ گئے۔

ربیعہ کی شادی ہو گئی۔ محفوظہ نے بھی سکون کا سانس لیا۔ گو یہ سب کچھ ضرورت کے اثاثے بیچ کر ہوا تھا لیکن اس کے علاوہ وہ اور کچھ وسائل نہ رکھتی تھی۔ محفوظہ شکوہ کرنے والی عورتوں میں سے نہ تھی۔ رب کا شکر ہر وقت اس کی زبان پر رہتا تھا۔ سو اس کی زبان میں تلخی نہ تھی۔ شکر انسان کو بڑا ہی میٹھا رکھتا ہے، مطمئن رکھتا ہے۔ کچھ فکر آتا بھی ہے تو ٹکنے نہیں پاتا اور رب پر بھروسا اس کو طاقت بخشتا ہے۔ محفوظہ نے بھی تمام سرد و گرم اسی طرح سہے، اپنی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے ادا کرتی اور زندگی رواں دواں رہتی۔ ربیعہ اپنے گھر میں خوش و خرم تھی۔ اولاد کا سکھ دیکھ کر والدین میں جیسے توانائیاں دوڑ جاتی ہیں۔ سو محفوظہ نے بھی رشید بیگ کی تمام کمزوریوں اور غیر ذمہ داریوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو گھر کا ماحول ابتر ہو جاتا، جس میں سب سے زیادہ نقصان بچوں اور پھر عورت کا ہی ہوتا ہے۔

محفوظہ نے تمام عمر یہ فلسفہ ذہن میں رکھا کہ آئیڈیل کوئی حقیقی وجود نہیں ہوتا ماسوائے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ہر لحاظ سے کامل تھے۔ نہ ہم کسی کے آئیڈیل نہ کوئی ہمارا، اگرچہ فاصلہ سے کوئی کتنا بھی مہان لگے، دن رات ساتھ گزارنے میں اندازہ ہوتا ہے کہ ہر انسان کوئی نہ کوئی ایسی خامی رکھتا ہے جو ہمیں بخوشی برداشت کرنی ہو گی تبھی زندگی مسکراتی نظر آئے گی۔ بس فرق یہ ہے جب خامیوں کا پلڑا ہماری نگاہ میں خوبیوں پر حاوی ہوتا نظر آتا ہے تو ہمیں اس وجود سے بیزاری ہو جاتی ہے۔

محفوظہ نے اسی فارمولے کے تحت کہ چار دیواری میں رشید بیگ کے ساتھ معاشرے میں وہ لاتعداد مسائل سے محفوظ ہے جن کا تنہا عورت قطعاً مقابلہ نہیں کر سکتی، صبر و شکر سے زندگی کو رواں دواں رکھا۔ رشید بیگ کے وجود کی یہ خوبی اس کو صبر دے دیا کرتی تھی۔ ورنہ مسائل کا ان دیکھا انبار اسے کپکپا ہی دیتا تھا جب کوئی سرسری بھی یہ کہہ دیتا کہ خواہ مخواہ اس نے رشید جیسے ناقدرے شخص پر پنی جذباتی اور مادی توانائیاں لگا کر خود اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔

''کچھ بھی ہے، شادی کے لیے بے شک ایسا شخص میرا انتخاب نہیں تھا اور نہ میرے والدین کا لیکن وقت کے ساتھ جو پرت اترتے چلے گئے ان پر صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے، میری کیفیت مزید قابل رحم ہو جائے گی بغیر بچوں کے باپ کے، ابھی لوگ میرا احترام کرتے ہیں پھر تنہا میرا ہر ہر قدم خوردبینی نگاہ سے دنیا دیکھے گی۔''

وہ بالعموم اسی قسم کا جواب ایسے خیر خواہوں کو دیتی جو اس کے چہرے کی شادابی کو بہت تیزی سے بڑھاپے میں ڈھلتا دیکھ رہے تھے۔ ذہنی دباؤ کبھی ابھرتا تو چہرہ بھی متفکر ہو جاتا۔ صبر اپنی جگہ اور فکروں کا بہاؤ بھی موجود۔

ماہ و سال اسی انداز فکر کے ساتھ اس گھر میں بیت رہے تھے۔ ربیعہ سے چھوٹی ماہ رخ بھی جوان ہو چکی تھی۔ نام بے شک اس کا ماہ رخ تھا، وہ عمومی سی ہی تھی۔ بلا کی ذہانت اس کی کشادہ پیشانی سے ظاہر ہوتی تھی لیکن بہرحال رشید بیگ کا تاثر ارد گرد پر ایسا نہ تھا کہ لوگ اس گھر میں رشتہ دیتے خوشی محسوس کرتے، محفوظہ جو بڑے حوصلے سے زندگی کو رواں رکھے تھی، اس فکر میں گھلنے لگی، وہ لوگ جو اس کو تعریفی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ بھی رشتے ناطوں کے لیے پہلو تہی کر گئے۔ اب ماہ رخ صرف محفوظہ کی نہیں رشید بیگ کی بھی بیٹی بن چکی تھی۔ حسن کا سرمایہ پاس ہوتا تو شاید اس کی

طاقت سے کوئی کھنچا چلا آ تا لیکن ایسا معاملہ بھی نہ تھا۔ ایسی وضع قطع کی بہت لڑکیاں اور دوسرے پرکشش گھرانوں میں موجود تھیں۔ ان کو چھوڑ کر محفوظہ اور رشید بیگ کی چوکھٹ پر کون جاتا۔ شہر کے کسی معیاری ہسپتال میں بطور فارماسسٹ کام کرتی تھی۔ سو خاندان کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس نے بھی ان مردوں سے رسمی رابطہ رکھنے میں ہرج نہ سمجھا جو اس سے دوستی کرنا چاہتے تھے مگر اس کا سرد رویہ ان کو خاموش کر دیتا تھا۔ پھر ان ہی دوستیوں میں سے کسی ایک سے بالآخر اس کی شادی ہو ہی گئی۔ یہ بھی رب کی مہربانی تھی کہ وہ دوسروں کے لیے دلبستگی کا ذریعہ بننے سے قبل ہی کسی ایک گھر کی عزت بن گئی۔ اس طرح کم از کم اس نے اپنی ماں کو پرسکون ضرور کر دیا جو مستقبل کے فکرات سے سہم رہی تھی۔

رشید بیگ کے لیے ماہ رخ کا یہ قدم خاصا ناگوار تھا۔ ''نہ حسب کا پتہ نہ نسب کا، تمھاری بڑو اس سے شادی رچا بیٹھیں۔''

وہ خاصی بلند آواز میں بڑبڑاتے اور محفوظہ کا بس نہ چلتا کہ وہ گھر سے کہیں باہر چلی جائے یا کان بند کر لے۔ مگر دونوں ہی کام وہ نہ کر پاتی تھی۔

عرصہ ہوا رشید بیگ نے معاشی ذمہ داری کا کل بوجھ محفوظہ کے کندھوں پر منتقل کر دیا تھا۔ کچھ گھنٹہ کے لیے اپنی بچی کھچی دکان پر جاتا۔ جہاں مال زمانہ بیتا ختم ہو چکا تھا۔ پڑوس کے دکاندار نے رشید کی دکان کا یہ حصہ بطور گودام کرایہ پر لینا چاہا جسے رشید نے فوراً ہی انکار کر دیا۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس کو بیٹے کا خیال تھا، اللہ ہی کی مہربانی تھی کہ اس کو یہ خیال آ گیا ورنہ امید نہ تھی کہ ایک بار اس آدمی کو دینے کے بعد وہ دکان کا قبضہ دوبارہ کچھ سالوں میں لینے کے قابل ہوتا۔

بیٹا میٹرک کر چکا تھا۔ کالج کے دو سال پورے کرتے ہی رشید بیگ کا خیال تھا کہ وہ اس کو کاروبار کی طرف لگا دے گا۔ پھر چاہے تو وہ کام اور تعلیم ساتھ ساتھ کرتا رہے۔ بنیادی طور پر رشید بیگ کو محنت کی عادت نہ تھی۔ وہ بیوی کی کمائی پر دن گزارنے میں شرم نہ محسوس کرتا تھا، کچھ عرصہ میں اس کا ارادہ بیٹے کی محنت پر زندہ رہنے کا تھا۔ آوارگی کی عادت یا کوئی بے جالت بھی نہ تھی۔ بس محنت نہ کرنا اس کے مزاج کا حصہ تھا۔ کچھ ہی وقت گھر سے باہر گزارتا، گھر میں ہوتا تو وہ ہوتا اور اس کے دائیں ہاتھ میں دبا ریموٹ اس کی گھر کے معاملات میں کسی بھی قسم کی مداخلت سے پرہیز محفوظہ اور بیٹے کے لیے ایک طرح سے بہتر ہی تھا ورنہ محفوظہ کی کڑھن میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ محفوظہ کو حیرت ہوتی کہ اس کا شوہر کس قسم کے مزاج کا انسان ہے۔ جس کو ٹی وی کے علاوہ دنیا کی کسی بھی چیز سے دلچسپی نہیں۔ کوئی لطیف لمحہ، کوئی رومانوی جملہ محفوظہ کی یادداشت میں رشید کے حوالے سے موجود نہیں تھا۔ ایک چھلا تھا سونے کا جس کے گرد چھوٹے چھوٹے نگینے جڑے تھے۔ وہ ایک واحد تحفہ تھا جو رشید بیگ نے اس کو رونمائی میں دیا تھا۔ اس کے بعد مجال ہے جو ایک ماچس کی تیلی برابر کچھ اس نے محفوظہ کو دیا ہو۔ کبھی محفوظہ نے اسے کچھ لا کر بھی دیا تو بنا کسی تاثر کے رشید بیگ نے اسے ایسے تھاما جیسے کہہ رہا ہو ''خواہ مخواہ لائی ہو'' شیشے کی سی کتنی کرچیاں محفوظہ کے دل میں چبھ جاتیں۔

ایک لمبے عرصے تک اس نے ہمت نہ ہاری محض اس امید پر کہ ایک دن رشید بیگ کے دل میں وہ جذبہ جگا ہی دے گی۔ اسے کبھی کبھی حیرت ہوتی کہ اس کے ماں باپ کو رشید بیگ میں ایسے کون سے لعل نظر آئے تھے جو اپنی اولاد حوالے کر دی۔

''خاندانی لڑکا ہے، اپنا ذاتی کاروبار ہے، کم گو ہے، کسی لت میں نہیں۔ ہماری لڑکی سکھ سے رہے گی۔''

یہ اس کے باپ کا وہ جملہ تھا جسے وہ یاد ہی نہ کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ جو بظاہر اس وقت لعل لگے تھے ان کی حقیقت وقت کے پرتوں نے دکھائی تو محفوظہ کے پاس کوئی راستہ نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ ''صبر جمیل'' کی تصویر بن جائے جو کہ وہ بن گئی۔

ماہ رخ کی شادی کے بعد نہ جانے کیوں اس کا دل بہت زیادہ آزردہ رہنے لگا تھا وہ باتیں جو ماں بیٹی ایک دوسرے سے بانٹ کر ذہن کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتی تھیں، وہ اب شاذ و نادر ہی ہو گیا تھا۔ محفوظہ نہ چاہتی تھی کہ ماہ رخ کی زندگی کے ان سالوں میں وہ باتیں اس کے باپ کے

حوالے سے اس کے ذہن میں جائیں جن کے آئینہ میں وہ اپنے شوہر کی تصویر دیکھنی شروع کردے۔

ربیعہ کے شوہر کی چند سال قبل لاہور میں ٹرانسفر ہو چکی تھی سو اس سے رابطہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ میں چند منٹ کے لیے موبائل فون پر ہوتا بھی تو محفوظہ کوئی بھی ناخوشگوار بات اس سے نہ ذکر کرتی۔ ربیعہ کے بچے خاصے شرارتی تھے اس کے لیے ان کو پالنا ہی امتحان تھا۔ ماں اس کو مزید کسی ذہنی دباؤ میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ شکر تھا کہ وہ کراچی آ کر بھی ماں کے گھر نہیں قیام کرتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ بچوں کے سوالات ننھیال کے ماحول سے متعلق ایسے ہوں گے جن کے تسلی بخش جوابات ان کو نہ مل سکیں گے۔ لہٰذا وہ اپنی سسرال کے ہلکے پھلکے اصرار پر بھی مستقل وہیں رکتی، کبھی کبھار ہی بچوں کو نانی کے گھر لاتی۔ چاہے ہر روز سسرال کی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ آتی لیکن نہ محفوظہ اسے دو چار دن رکنے کا کہتی اور نہ وہ خود ایسا کچھ تذکرہ کرتی۔ ماں سے ملتی، دل کی ڈھیروں باتیں کرتی، باپ پر نگاہ ڈالتی، بھائی کے لاڈ اٹھاتی اور چلی جاتی۔ ہر سال آمد پر ماں کو بھائی کے لیے تحفہ کے نام پر خطیر رقم کا لفافہ دیتی کہ جوان ہوتے لڑکوں کے بے شمار خرچے ہوتے ہیں۔ محفوظہ کو کبھی بیٹی سے یہ لفافہ لینا گوارا نہیں ہوتا تھا۔ مجال ہے جو کبھی انھوں نے اسے ہاتھ میں تھاما ہو۔

''امی رکھ لیں، عروہ سے چند برس بڑا میرا دیور اتنی رقم ایک وقت میں اپنے دوستوں کی دعوت میں خرچ کر دیتا ہے۔ عروہ کے تو اس میں کئی ضروری خرچ پورے ہو سکتے ہیں۔''

جوتوں کے ریک پر رکھے بھائی کے جوتوں پر نگاہ جماتے اس نے ماں سے دھیمی آواز میں کہا۔ جوتوں کی حالت خستہ نہ تھی لیکن بدنما ضرور ہو چکی تھی۔ محفوظہ نے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا اور اپنے ہاتھ سے بنائی میٹل کی چوڑیاں اس کے حوالے کر دیں جن پر کمال مہارت سے گنگا جمنی نمونہ پینٹ کیا گیا تھا۔ ان چوڑیوں پر نگاہ پڑتے ہی ربیعہ ساکت سی ہو گئی۔

(جاری ہے)

☆......☆......☆

سیر و سیاحت دوسرا حصہ

میمونہ حمزہ

چند روز امارات میں!

شارجہ کی پہلی رات ایسی ہی تھی جیسی کسی اجنبی مقام پر ہوتی ہے۔

ہم باجی کے کمرے میں تھے، ہمیں گھپ اندھیرے میں سونے کی عادت ہے، سو آدھی رات کو دبیز پردے گرا لئے۔ صبح باجی نے نماز کے لئے اٹھا دیا، نماز سے فرصت کے بعد اپنے ہمراہ ورزش بھی کروائی، اور ابھی ہم کمر سیدھی بھی نہ کر پائے تھے کہ وہ دو جہازی سائز کے گلاسوں کے ساتھ موجود تھیں، پلیٹ میں سیب بھی رکھے تھے، گلاس منہ کو لگایا تو گرم بے مزہ پانی! (ویسے تو پانی کے خالص ہونے کی شرائط میں اسکا بے بو، بے رنگ اور بے ذائقہ ہونا شامل ہے)، ہم نے حیرت سے باجی کو دیکھا، بولیں، گرم پانی ہے شہد ملا! ہمیں پہلی صفت سے اتفاق تھا، مگر شہد کہاں تھا؟؟ وہ ڈالا گیا تھا یا سنگھایا گیا تھا، یا گلاس شہد کی بوتل کے ساتھ صرف رگڑا گیا تھا، ہم احتجاج کرتے رہے، مگر باجی کا خیال تھا، کہ بس شہد کی اسی قدر مقدار جسم کی چربی گھلاتی ہے، آدھا چائے کا چمچ شہد، دو گلاس گرم پانی میں، ہاں سیب زندہ باد کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے! شکر ہے بازار میں شوگر فری سیب نہیں ملتے، اللہ کی خلاقی کا کیا کہنا، ورنہ ہم تو بے ذائقہ مارے جاتے!!

صبح سویرے ٹیرس سے باہر جھانکا، سمندر خاموش تھا، اور اسکے ارد گرد زندگی رواں دواں، اٹھارہ منزل کی بلندی سے نظارہ بڑا اچھا لگ رہا تھا، سامنے آسٹریلین سکول تھا، جہاں بسیں بچے ڈراپ کر رہی تھیں، صاف ستھرے، خوش باش بچے، جو بھاگ بھاگ کر اندر جا رہے تھے، دنیا کا مستقبل!!

باجی ناشتے کا پوچھنے پھر حاضر تھیں، سنو دوا بلے انڈوں کی سفیدی کھاؤ گی یا ایک مکمل انڈا؟؟ ہمیں ادھوری چیزیں اچھی نہیں لگتیں، اگر دو مکمل مل جائیں تو اچھا ہے، مگر وہ باجی ہی کون جو مان جائیں، سو چند منٹ بعد ہم میز پر تھے، اور ایک انڈا، ایک توس اور ایک کپ پھیکی چائے سکمڈ ملک والی سامنے تھی، نجانے دودھ کو بالائی سے محروم کرنے والی مشین کس نے ایجاد کر لی تھی، دودھ سے بالائی اتارتے اتارتے قومیں بھی بالائی سے محروم ہو گئی تھیں، اور جو کچھ اوپر آ گیا تھا، وہ بالائی کہلانے کا ہرگز حق دار نہ تھا، اس میں اوپر آنے یا لیڈری کرنے کے خصائص ہی نہ تھے۔ مگر جس طرح ہم بالائی کے بغیر چائے پی رہے تھے اس طرح لیڈر کی تلاش بھی کم وبیش چھوڑ چکے ہیں، اب کون پوچھے؟ **أليس منكم برجل رشيد**

ہمیں ناشتہ کروا کر باجی اپنی منزل کی جانب روانہ ہوئیں، انہیں کئی جگہ قرآن کی کلاس لینی تھی، کہیں انفرادی اور کہیں اجتماعی، ہمیں وہ بتا گئیں، کھانے کو سب کچھ موجود ہے، بلکہ بھوک لگے تو سات بادام، دو خشک خوبانیاں اور ایک انجیر کھا لینا، عصر کے وقت تک ہم خوب بور ہوئے، زیادہ وقت سفر کی تھکاوٹ اتار کر گزارا، باجی واپس آئیں، تو تھکی ہوئی تھیں، بولیں کچھ کھایا تم نے؟ ہم نے بتایا، ہم نے انکی ہدایت کے مطابق جب (بلکہ جب جب) بھوک لگی، بادام خوبانی اور انجیر کی مقررہ مقدار کھا لی ہے۔ صبح کے ناشتے کا ادھار ہم نے چکا دیا تھا۔

شام کو ہمارے شوہر نامدار ابوظہبی پہنچ رہے تھے، وہاں سے بذریعہ بس اتحاد ٹرمینل پر پہنچنا تھا، اور وہاں سے بذریعہ کار گھر، یعنی چند گھنٹوں میں تین امارات کی زیارت کرنا تھی۔ آج کھانا بھی خاص تھا۔

ابھی ہم گھر ہی تھے کہ انکی پہلی کال آئی، کہ ابوظہبی سے نکل چکا ہوں، بیس منٹ میں دبئ پہنچ رہا ہوں، حسن البناء گاڑی کی چابی لیکر بھاگے، ہم نے ہانک لگائی، ہمیں بھی جانا ہے استقبال کرنے، حسن کی گاڑی ابھی شارجہ التعاون مال کراس کر رہی تھی، جب انکے پہنچنے کی اطلاع آ گئی، چونکہ ڈاکٹر صاحب الماتی سے آ رہے تھے، اس لئے انکی موبائل سروس بند ہو چکی تھی۔ انہوں نے حسن کا نمبر نوٹ کر رکھا تھا، اور اب کسی سے انسانی بنیادوں پر ہمدردی کے ناطے رابطہ کروا رہے تھے۔

ہم شارجہ کے پل کے نیچے سے گزرے تو حسن نے بتایا کہ ہم دبئ میں داخل ہو گئے ہیں۔ دائیں بائیں بڑی بڑی بلکہ حقیقی معنوں میں آسمان سے باتیں کرتی عمارتیں تھیں، اور ٹریفک اتنی تیز، اور گاڑیوں کا جمِ غفیر، شاید یہی سب محرکات ہیں جنہوں نے اضطراب کو اتنا بڑھا دیا ہے، سامنے سڑک کے اوپر ایک آہنی پل پر ''سالک'' لکھا نظر آیا، حسن نے بتایا کہ ابھی ہمارے راستے میں چار سالک آئیں گے، ہر سالک سے جب گاڑی گزرتی ہے تو خودکار انداز میں ٹیکس کٹ جاتا ہے، اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ گاڑی کی سکرین پر سالک کا ایک سٹکر چسپاں کر دیا جاتا ہے، اور فون کارڈ کے انداز میں اسے موبائل یا انٹرنیٹ کے ذریعے ''اپ لوڈ'' کر دیا جاتا ہے، جتنی بار گاڑی اس سے گزرتی ہے رقم منہا ہوتی رہتی ہے، رقم ختم ہونے سے پہلے بار بار تنبیہی پیغامات بھیجے جاتے ہیں، اسکے ختم ہونے پر کچھ دن بغیر فائن سالک حساب کتاب بتاتا رہتا ہے اسے بعد فائن لگنا شروع ہوتا ہے، جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا ہی رہتا ہے، بلکہ ضرب ہوتا رہتا ہے۔ محسن نے بتایا کہ ہمارے آفس میں ایک روسی خاتون تھی، جو اس سارے پروسیس سے بے خبر گاڑی چلاتی رہی، حتی کہ جب اسکا ٹیکس لاکھوں میں پہنچ چکا تھا ایک روز اس کی گاڑی پکڑ لی گئی، اور پھر وہ تھی اور قانون تھا، اور قانون بھی دبئ کا، اس نے بہت شور مچایا کہ مجھے یہ سب معلوم ہی نہ تھا، مگر!!

الشیخ زاید روڈ پر حسن گاڑی بھگا رہا تھا، اسے سارا راستہ یاد تھا، نور اسلامک بنک سے رائٹ نیکسٹ ٹو میٹرو سٹیشن ہونا ہے، مگر کیا کہا جائے کہ

عین وقت پر پھر ڈاکٹر صاجب کے نئے ہمدرد کا فون آ گیا، حسن رائٹ کے بجائے لیفٹ مڑ چکا تھا، اور جب آپ سیدھے کے بجائے الٹے مڑ جائیں تو اسکی قیمت تو چکانی پڑتی ہے، شاید اسی لئے دن میں کئی مرتبہ اهدنا الصراط المستقيم کی پریکٹس کروائی جاتی ہے، دبئی میں غلط مڑنے کے معنی ہیں کہ آپ اس راستے پر چلتے ہی جائیں، حتی کہ اگلا موڑ آ جائے، وہیں سے آپ اپنی سمت سیدھی کر سکتے ہیں، سیدھے ہوں اور اب پورے دھیان سے رہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غلطی کر جائیں، نور بنک پر اتر کر حسن عقب میں بھاگا، مگر آگے جا کر معلوم ہوا کہ اتحاد ٹرمینل ڈبل روڈ کے دوسری جانب ہے، لہذا پھر سفر شروع ہو گیا، جب ہم ٹرمینل پر پہنچے تو ڈاکٹر صاحب لبِ سڑک کھڑے تھے۔

وہ بھی پہلی مرتبہ دبئی آئے تھے، حسن سرسری تعارف بھی کروا رہا تھا، اور یہاں کی مشکلات بھی گنوا رہا تھا، زندگی آسان تو ہے، مگر اسکی قیمت بہت ادا کرنی پڑتی ہے، اچھی عمارتیں، پرتعیش گاڑیاں، بڑے بڑے شاپنگ مالز، جن میں زندگی کی ہر قیمتی شے پکار پکار کر بکنے کی دعوت دے رہی ہے، ترقی کرتے کرتے انسان وہاں پہنچ گیا ہے جہاں اسکے پاس اپنے لئے وقت نہیں رہا، اپنے گھر اور بیوی بچوں کے لئے فرصت نہیں بچی، یہاں جن کمپنیوں میں کام کرنے کی بڑی بڑی تنخواہیں ہیں، وہ آپکا پسینہ ہی نہیں گراتیں، آپ کو نچوڑ لیتی ہیں، یہاں ایسی ملازمتیں بھی ہیں جو آپ سے چوبیس گھنٹے آن لائن رہنے کا تقاضا کرتی ہیں، آپ کو بہترین موبائل اور لیپ ٹاپ تو مل جاتا ہے، آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ اور مادی ترقی کرتے کرتے آپ اس زینے پر پہنچ جاتے ہیں جو مادی لحاظ سے تو بہت بلند ہے مگر انسانی لحاظ سے ترقی معکوس کا عمل شروع ہو جاتا ہے، اور پھر اس ترقی کا کیا کیجئے جو آپ کو رشتے بھلا دے، اعلیٰ اخلاقی اوصاف پر گرد جم جائے، سونا جاگنا، کھانا پینا یاد رہ جائے مگر اس میں سے اپنے لئے، یا رب کی یاد کے لئے وقت نہ نکلے۔

اور اب تو یہاں فکری آزادی بھی خطرے میں ہے، پہلے تو سیاسی جماعتوں اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی تھی، مگر اب بہت سے غیر سیاسی لٹریچر کا داخلہ بھی بند ہو گیا ہے، بلکہ پتا چلا کہ اردو ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' کی ترسیل پر بھی پابندی لگ گئی ہے، ایک صاحب نے کسی طریقے سے بحرین کے راستے چند رسالے منگوائے، تو ان رسالوں کے ساتھ انہیں بھی ڈی پورٹ ہونا پڑا۔ اسی طرح مصر کے گزشتہ دورِ ابتلاء میں کویت، امارت اور سعودی عرب نے پریشان حال مسلمانوں کی مدد کی تھی، انکے لئے اپنے دروازے کھولے تھے، مگر اخوان کے اقتدار اور ''عرب بہار'' کے خوف نے انکی پالیسی بھی تبدیل کروا دی، اب برس ہا برس کے اخوان رہائشی بھی خطرے میں ہیں۔

واپسی کا سفر ہلکا تھا یا ہمسفر نے آسان بنا دیا تھا۔ ٹریفک کم ہو چکی تھی، ہم ''ممظر'' کے علاقے میں داخل ہو چکے تھے، اور چند منٹ بعد برج الزاخر میں! فائزہ کا اندازہ درست تھا، وہ کھانا میز پر لگا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بھائی منیر احمد خلیلی سے شاید تین برس بعد مل رہے تھے، پاکستان سے باجی کے نواسے (عمارہ و فیصل کے بیٹے) کی پیدائش کی خوش خبری ملی تھی، سو ہر جانب خوشیاں اور مبارک بادیں تھیں! کھانے کے بعد قہوہ، ہمیں تو باجی نے وہ بھی کڑوا ڈائیٹ قہوہ پلایا، کھانا البتہ ہم نے اپنے شوہر نامدار کی سرپرستی میں جی بھر کر کھایا تھا، سویٹ ڈش بھی، بلکہ اس کے بعد پاکستان سے آئی ہوئی دو قسم کی مٹھائیاں بھی کھائیں، میں نے انہیں اور انہوں نے مجھے اصرار کر کے کھلائیں، باجی مسکراتی رہیں، بھئی یہ تو چلے جائیں گے، باقی دن تو ہمارے ساتھ ہی ہونگے۔

صبح ہوتے ہی ہم نے اعلانِ بغاوت کر دیا۔ اپنے ہاتھوں سے دیسی گھی کے پراٹھے بنائے، اور بھرپور ناشتے سے دن کا آغاز کیا، جمعہ مبارک تھا، میرے لئے دہری خوشی تھی۔ مجھے مسجد جاتے دیکھ کر فائزہ بولی، اگلی مرتبہ میں بھی جاؤں گی، ہم فیصل آباد میں جمعہ اور عید کی نماز پڑھنے جاتے تھے، مگر یہاں خواتین نہیں جاتیں۔ گاڑی میں مزید گنجائش بھی نہ تھی۔

ہم القصباء کی مسجد کی جانب چلے، محسن نے بتایا کہ اس مسجد کی خوبی یہ ہے کہ یہاں انگلش میں خطبہ ہوتا ہے، اور سمجھ آ جاتا ہے، یہ مسجد دعوت الی

اللہ کا مرکز بھی ہے، ڈاکٹر ذاکر نائیک، نعمان وغیرہ کے لیکچرز بھی یہاں ہوتے ہیں، میں خواتین ہال کی جانب بڑھی، یہ بہت بڑا ہال نہ تھا، بلکہ نمازی خواتین کے مقابلے میں تنگیِ داماں کا گلہ کر رہا تھا۔ بہت سمٹ کر ایک جانب تھوڑی سی جگہ ملی، میں تحیہ المسجد ادا کر کے خطبہ سننے لگی۔ ہر چند ثانیے بعد دروازہ کھلتا اور دو تین اور خواتین اندر آ جاتیں، اور زبانِ حال سے ''توسعوا'' کا مطالبہ کرنے لگتیں، بخدا ہم نے دیکھا کہ وہ ہال کتنی ہی خواتین کو سمیٹ چکا تھا، قرآن کی آیت 'واذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح اللہ لکم' (الMجادلہ) کا معنی سمجھ آ رہا تھا۔

اب کے ایک جسیم ڈیل ڈول والی سیاہ رنگت خاتون اندر داخل ہوئی، اس نے عربی میں کچھ کہا، اور پھر جہاں جہاں ہلکی سی بھی گنجائش نظر آئی خواتین بٹھانی شروع کر دیں، مجھے خطبے میں خلل ناگوار محسوس ہو رہا تھا، مگر اس نے مزید گنجائش نکال دی، بلکہ صفوں میں ایک اور صف بھی بنوا دی، نماز پڑھ کر باہر نکلی تو کتنی خواتین دھوپ میں نماز ادا کر رہی تھیں، اور ان میں وہ خاتون خود بھی تھی، میرا دل چاہ رہا تھا، جا کر ان کے ہاتھ چوم لوں، ہماری امت کو ایسے ہی چہرے چاہئیں، جو امت کو سایے میں کھڑا کر کے خود دھوپ میں کھڑے ہو سکیں!

واپسی پر حسن محسن کہیں سیر کے پروگرام کی تجویز دے رہے تھے، اور ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے، میری خیر ہے مگر ٹائم نکال کر خالہ کو ضرور سیر کروا دیں، اور ہم پریشان تھے، ہمارا حال دو ملاؤں میں مرغی والا نہ ہو جائے!

شام کو باجی ہمیں صحاری مال لے گئیں۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب سے تحفہ وصول کرنا تھا، سو بقول انکے باجی انہیں گھیر کر لے آئی ہیں، مگر صحاری میں سونے کی کوئی بھی اچھی دکان نہ ملی، سب اٹھارہ کیرٹ گولڈ تھا۔ ہاں البتہ بے بی شاپ تھی، اور اس پر بھی سیل! یہاں سیل کا مطلب سیل ہی تھا، نہ تو چیزوں کی کوالٹی کم کی گئی تھی، نہ قیمت کو بڑھا کر کمی ظاہر کی گئی تھی، اور بچے تو جنت کے پھول ہیں، سو انکی دلداری میں جیب خاصی ہلکی ہو گئی۔

واپس آئے تو چھوٹی بہن عابدہ، نوید بھائی اور انکی بیٹیاں آئی ہوئی تھیں، حسین شیبا اور نور تھے، پاکستان سے عبدالودود بھائی بھی آفس کے کام سے آئے ہوئے تھے، آج کا کھانا بڑا کھانا تھا، کچھ کھانا فائزہ نے بنایا، اور کچھ شیبا گھر سے بنا لائی، خوب رونق لگی، اور جب محفل جمی تو رات کے گزرنے کا احساس تک نہ ہوا، عابدہ سے تقریباً پانچ برس بعد ملاقات ہو رہی تھی، بچے بچپن سے لڑکپن اور جوانی کی حدود میں قدم رکھ رہے تھے، عروہ اور عروبہ کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا، باہر لاؤنج میں مردانہ محفل گرم تھی، جس میں ڈاکٹر صاحب کے بقول وہ صرف ٹھنڈک پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اچانک باہر سے ڈالر کی ڈیمانڈ وصول ہوئی، وہ بھی ایک ڈالر کے نوٹ کی، جو صرف ہماری جیب میں تھا، وضاحت چاہی تو معلوم ہوا منیر بھائی اسکا دیدار کرنا چاہتے ہیں، بتا رہے تھے کہ وہ ''علم الیقین'' کی بنیاد پر ایک ڈالر پر بنے ''پیرامڈ'' اور اس میں چمکتی دجالی آنکھ اور ''فری میسنز'' پر چھ عدد کالم لکھ چکے ہیں، بلکہ یقیناً ستائش بھی پا چکے ہیں، اور اب اگلا کالم ''عین الیقین'' کی بنیاد پر لکھنا چاہتے ہیں، اللہ کرے کہ اسکا فائدہ بھی ہو، کیونکہ ''بن جوریون'' نے کہا تھا: ''ہم نے حکومتِ اسرائیل'' کا منصوبہ افشا بھی کر دیا مگر ہمیں کچھ فکر لاحق نہ ہوئی، کیوں؟! کیونکہ عرب (آپ اسے مسلمان بھی کہہ سکتے ہیں) مطالعہ نہیں کرتے، اور اگر پڑھ بھی لیں تو انہیں سمجھ نہیں آتا، اور اگر سمجھ جائیں تو بھی (تدارک کا) علم نہیں رکھتے، اور اگر عمل کر بھی لیں تو احسن عمل نہیں کرتے، اور اچھا بھی کر لیں تو اخلاص نہیں برتتے''۔ بس مجھے تو سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ جس ایک نوٹ پر بقول ناقدان پوری دنیا کی یہودی تسخیر کا نقشہ موجود ہے، اس پر بہت نمایاں الفاظ میں ''ان گاڈ وی ٹرسٹ'' لکھا ہے، اور خدا پر اس بھروسے کا کیا عالم ہوگا، اور کیا اسے بھی دھوکا دیا جا سکتا ہے؟ اور کیا بھروسے کا برتن چکنا چور ہونے کے بعد بھی جڑ سکتا ہے؟!

اگلے دن ہم پھر باجی کے ہمراہ تھے، ٹرین مارکیٹ کی جانب سفر ہو رہا تھا، ٹرین مارکیٹ ٹرین کی شکل میں بنی مارکیٹ ہے، دکانیں بوگیوں کی شکل کی ہیں، جس پر نمایاں حروف میں ''سوق الذهب'' اور ''جولد مارکیت'' لکھا ہے، دونوں اطراف میں مارکیٹ ہے اور درمیان میں سٹیشن کا منظر!

ہم ونڈو شاپنگ کرتے ہوئے ''زاہد اینڈ کو'' میں داخل ہوئے، سیلز بوائے بنگالی لڑکے تھے، ہمیں اندر جا کر معلوم ہوا کہ سونے کی قیمت تو پوری مارکیٹ میں ایک ہی ہے مگر بنوائی یعنی ''میکنگ'' کے نام پر ساری تجارت ہوتی ہے، اب ہم سونے کی قیمت اور وزن پوچھتے اور باجی میکنگ کا حساب کتاب کرتیں، تھوڑی دیر میں سیلز مین کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ہمیں غچہ دے سکتا ہے باجی کو نہیں!! آخر کار اس نے ہتھیار ڈال دیے، کیونکہ باجی ہتھیار اٹھانے والے قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں ڈالنے والے سے نہیں!! اسی دوران ظہر کا وقت ہو جانے پر مالک ہولے سے اٹھا اور نماز پڑھ کر آ گیا، ہم نے کچھ ڈالر اور کچھ درہم جو آج ہی کیش کروائے تھے ادا کئے اور باہر نکل آئے۔

باجی ہمیں ''رولا مارکیٹ'' لے آئیں، جو نہایت خاموش اور پرسکون مارکیٹ ہے، نجانے اس کا نام ''رولا'' کس نے اور کیوں رکھ دیا، حالانکہ یہاں پر عبایا شاپ والے نے بھی بڑے آرام سے قیمت کم کر کے عبایا دے دیے، ابھی ہماری گاڑی واپسی کے لئے پر تول رہی تھی، کہ اچانک باجی کا فون بول پڑا، فون جیولر شاپ سے آیا تھا، میڈم آپ ابھی جو زیورات لے کر گئی ہیں اس میں آپ نے تین بالیوں کی قیمت ادا نہیں کی، باجی نے بڑی تسلی سے پوچھا، اور کیا بالیاں ہم لے آئے ہیں؟ بولا، جی ہاں، باجی اسی سکون سے بولیں: چلو پھر چھٹی کرو، ہم واپس نہیں آ رہے! ہم دکان پر پہنچے، قیمت ادا کی، باجی نے پوچھا: آپ پریشان نہیں ہوئے؟، بولا پریشانی کیسی، گاہک معلوم تھا، فون نمبر لکھا تھا، حساب سارا موجود تھا، پریشانی تو جب ہوتی اگر لکھے حساب میں کوئی سقم ہوتا۔ باہر نکلنے لگے، تو سیلز مین نے بتایا: زاہد صاحب کے بیٹے شاہد کی پچھلے رمضان میں ایک لاکھ ڈالر کی لاٹری نکلی، مگر انہوں نے اسے استعمال نہیں کیا، زاہد صاحب پہلی مرتبہ گفتگو میں شامل ہوئے، بتانے لگے میرا اکلوتا بیٹا ہے، اس کی اسی کے اوپر شاہد اینڈ کو کی سونے کی دکان ہے، ہماری لاٹری نکلی تو اس نے کہا، ابا جان اللہ تعالی نے ہماری آزمائش کی ہے، یہ مال ہمارے لئے جائز نہیں ہے، پھر ہم نے تمام مال صدقہ کر دیا، دو مریضوں کے گردے ٹرانسپلانٹ کروائے، اسلام آباد میں ایک اولڈ ہوم بنوا رہے ہیں، بس سب حاجت مندوں پر خرچ کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب کی ۲۱ تا ۲۳ اپریل کانفرنس تھی، وہ پیر کی صبح حسن کے ساتھ ہی چلے گئے، باجی کا اصرار تھا کہ ہم انکے ہاں رہیں، مگر شام کو ڈاکٹر صاحب آئے تو ''نووٹل ہوٹل'' کی بکنگ بھی ساتھ تھی، محسن نے آن لائن سارے انتظامات کروا دیے، ہم نے جلدی جلدی مختصر پیکنگ کی، باجی نے نہ صرف کھانا لگا دیا بلکہ ساتھ لے جانے کے لئے پھل، جوس، میٹھا سب تیار کر دیا، اور ہمارے نہ نہ کرتے بہت کچھ رکھوا دیا، محسن نے گاڑی نکالی۔

ہم ایک مرتبہ پھر دبئی کی جانب محوِ سفر تھے، دبئی، جو امارات کا سب سے گنجان آباد شہر ہے، رقبے کے اعتبار سے یہ دوسری بڑی امارت ہے جس کا رقبہ ۴۱۱۴ مربع کلومیٹر ہے، دبئی ۱۰۹۵ء میں دریافت ہوا، ۱۷۹۹ء سے یہاں آبادی ہے، ۱۸۳۳ء میں یہاں الشیخ مکتوم بن بتی المکتوم نے ۸۰۰ افراد پر مشتمل اپنے قبیلے کو یہاں آباد کیا، اور دوسری سعودی سٹیٹ قائم کی، اور جب تختِ برطانیہ کی شرق و غرب میں پھیلی سلطنت ایک ایک کر کے مسلمان ممالک نگلتی چلی جا رہی تھی، اس وقت بھی یہ علاقہ برطانیہ سے معاہدے کے بعد آزاد قبائلی علاقے کے طور پر قائم رہا، برطانوی معاہدے میں اسکا نام ''الوصل'' تھا۔

دبئی کا نام ایک خاتون ''دبیا'' کے نام پر ہے، ایک رائے کے مطابق ''دبا'' سوق یا بازار کے طور استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کا نام ''دِبا'' یا ''دوبا'' پر بھی ہو سکتا ہے، جو خلیج عرب کا مشرقی ساحل ہے، جسے سیاسی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

دبا الفجیرہ جس پر امارات الفجیرہ کی حکمرانی رہی۔

دبا الحصن جس پر الشارقہ یا شارجہ نے حکمرانی کی۔

دبا البیعہ جس پر عمان نے حکمرانی کی۔

ایک رائے کے مطابق یہ ''دبا دبی'' تھا، یعنی ان لوگوں کا علاقہ جو بہت پیسے کے ساتھ آئے، کیونکہ یہ قبیلہ امراء پر مشتمل تھا۔

اس علاقے میں آغاز ہی سے مختلف عادات کے لوگ آباد ہیں، آج بھی یہاں کئی ملکوں سے آئے ہوئے لوگ بس رہے ہیں، جنوری ۲۰۱۳ء کے اعداد و شمار کے مطابق علاقے میں ۲۱ لاکھ سے زائد نفوس آباد ہیں، جن میں ۵۳ فیصد بھارتی، ۱۷ فیصد اماراتی، ۱۳ فیصد پاکستانی، اور باقی دیگر ممالک کے افراد ہیں، امارت کا سرکاری مذہب اسلام ہے، یہاں ۹۵ فیصد مساجد اہل سنہ کے زیر انتظام ہیں، دیگر مذاہب کو بھی مذہبی آزادی حاصل ہے، یہاں کم از کم تین چرچ، ایک مندر اور ایک گردوارہ ہے، ۲۰۰۱ء میں جبل علی کے مقام پر حکومت کی جانب سے چرچ کے لئے جگہ دی گئی، اس پر تعمیر کے لئے مقامی اور باہر دونوں جگہ پر فنڈ جمع کیا جا سکتا ہے، مگر یہاں پر کوئی مشنری لٹریچر تقسیم نہیں کیا جا سکتا، اس حوالے سے سخت پابندی عائد کی گئی ہے۔

(جاری ہے)

☆☆☆

ملاقات

آسیہ راشد

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر!

ایسے لوگ بھی ہیں جو ہسپتالوں کے مایوس اور اداس ماحول میں اُمید، خوشیاں، سکون اور صحت بانٹتے ہیں...... محض اس لیے کہ مخلوق خوش ہو تو خالق بھی خوش ہو جائے۔

انمول (Inmol) کینسر ہسپتال لاہور کے خوشحال علاقے نیو مسلم ٹاؤن میں واقع ہے۔ یہ نہ صرف کینسر کے مریضوں کی بہترین علاج گاہ ہے بلکہ مستحق مریضوں کو مفت طبی سہولت دیتا ہے۔ گورنمنٹ کا یہ ہسپتال پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے تحت کام کر رہا ہے۔ اس ہسپتال میں PWSI پیشنٹس ویلفیئر سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ موجود ہے جس کا کام مریضوں کی فلاح و بہبود ہے۔ یہ ادارہ مریضوں کے کھانے پینے اور ان کے تیمارداروں کے لیے رہائش اور خوراک کا مفت انتظام کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مستحق مریضوں کے لیے مفت طبی سہولتیں فنڈز کے ذریعے اکٹھی کرنے کا اہتمام بھی کرتا ہے۔

پُرخلوص، سادہ و باوقار یاسمین ضیا صاحبہ اس ادارے کی روح رواں ہیں۔ انھوں نے ایم ایس سی بی ایڈ سوشل ورک پنجاب یونیورسٹی سے کیا اور جڑانوالہ شہر سے اپنے کیریئر کا آغاز سوشل ورک ڈیپارٹمنٹ سے کیا۔ بعدازاں رحیم یار خان، صادق آباد، فیصل آباد کے دارالامان اور ڈسٹرکٹ ہسپتال لاہور کے چمن (معذور بچوں کا ادارہ) اور پھر انمول میں تعینات رہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پچھلے چھ سال سے وہ یہیں رضا کارانہ کام کر رہی ہیں۔ وہ بتاتی ہیں:

جن دنوں میں اس فیلڈ میں آئی تو میں لوگوں کی حالت زار دیکھ کر رویا کرتی تھی۔ میرا دل کڑھتا اور میں بے قرار ہو جاتی مگر میرے بس میں کچھ نہ

تھا۔میری ایک ساتھی آسیہ میرے آنسو پونچھا کرتی اور مجھے تسلی دیتی۔میں سوچتی میں کیونکر ان مفلوک الحال لوگوں کی حالت بدل سکتی ہوں یا ان بیماروں کی صحت یابی میں ان کی مدد کرسکتی ہوں۔پھر اللہ تعالیٰ نے میری مدد کی اور میں نے ان کے حالات بدلنے کی ٹھان لی کہ جس حد تک ممکن ہو سکے میں مریضوں،غربا اور مساکین کی بہتری کے لیے کوشش کروں گی۔جہاں جہاں میری ملازمت رہی میں اپنی حد تک پوری تندہی،ایمانداری اور محنت سے کام کرتی۔میرے میاں فوجی فرٹیلائزر میں تھے۔ان کی جہاں جہاں پوسٹنگ ہوتی میں بھی اسی شہر میں تعیناتی کروالیتی۔

جن دنوں رحیم یار خان کے شیخ زید ہسپتال میں میری تعیناتی تھی وہاں ہم نے غریب مریضوں کے لیے گھروں سے فالتو دوائیاں اکٹھی کرنی شروع کیں۔اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ اسکولوں کے بچوں سے کہا جاتا کہ وہ اپنے گھروں اور محلے کے گھروں سے دوائیاں اکٹھی کرکے لائیں۔اسی طرح وہاں کے مقامی کالجوں کو ایک ایک وارڈ دے دیا جاتا کہ اگر کبھی ہمیں خون کی ضرورت پڑی تو وہ ہمیں مہیا کریں گے۔جب کبھی خون چاہیے ہوتا ہم اس کالج کو اطلاع کردیتے اور ہمیں فوراً تازہ خون مل جاتا۔وہاں کے تمام کالجوں میں مقابلہ تھا۔ہر کالج اپنے وارڈ کو خون مہیا کرتا۔

صادق آباد بہت پسماندہ جگہ ہے۔وہاں ٹی بی بے تحاشا ہے۔ٹی بی کے مریضوں کے لیے اگر کام کیا جائے تو وہ زندگی کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔ان کے ساتھ کام کرنے میں یہ احتیاط کرلینی چاہیے کہ ان کی تھوک کا ٹیسٹ کروالیا جائے۔اگر رپورٹ نیگیٹو آئے تو ان کے ساتھ کام کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

ایک لڑکی میرے پاس روزانہ اپنے بھائی کے ساتھ سائیکل پر بیٹھ کر آتی۔اسے ٹی بی تھی۔سخت سردی کے دن تھے۔وہ صبح صبح آکر میرے کمرے میں ہیٹر کے پاس بیٹھ جاتی اور اپنے گھر والوں کی باتیں سناتی کہ میری بہن میری ماں سے کہتی ہے:''ماں اس کا کچھ کرلے یہ بچنے والی نہیں''۔ مگر وہ بہت ہمت والی تھی۔اس نے سلائی سیکھ لی،خوش رہنا سیکھ لیا،یوں جلد صحت یاب ہوگئی اور معاشرے کی مفید رکن بن گئی۔

صادق آباد کے ہسپتال میں مَیں نے ٹی بی کے مریضوں کے لیے الگ حصہ تعمیر کروایا۔فیصل آباد ڈسٹرکٹ ہسپتال میں بھی میرا واسطہ ٹی بی کے مریضوں سے تھا۔ٹی بی ایسا مرض ہے جس کا مریض گھر،دکان،دفتر،کہیں بھی کوئی کام نہیں کرسکتا۔ایسے مریض کا سانس پھولتا ہے،جلد تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔کام نہ کرسکنے کی وجہ سے مریض ڈیپریشن کا شکار رہتا ہے۔ان دنوں سلطان عبداللہ صاحب ٹی بی وارڈ کے انچارج تھے۔میں نے ان سے کہا کیوں نہ ٹی بی کے مریضوں کو زندگی کی طرف لوٹانے کے لیے کام کیا جائے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں لہٰذا ہم نے ہسپتال میں ایک سلائی سکول بنایا جہاں مریض سلائی سیکھتے اور کام کرتے۔ان کے لیے خصوصی طور پر ڈائننگ ہال بنایا،میزیں کرسیاں رکھی گئیں،مریضوں کے کھانے پینے کے لیے بہترین انتظام کیا گیا کیونکہ ٹی بی کے مریضوں کے لیے اچھا کھانا پینا ضروری ہوتا ہے۔مریضوں کو اجازت تھی کہ وہ جتنا چاہیں کھا سکتے ہیں۔ہمارے اس اقدام سے مریضوں کو جلد روبصحت ہونے میں بہت مدد ملی۔

انہی دنوں ہماری ملاقات ایک بے حد مخیر شخص سے ہوئی جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔وہ سوت کا کاروبار کرتے تھے۔وہ صاحب ٹی بی کے مریضوں کے لیے بہت اہتمام سے کھانا بھیجتے مگر اپنا نام ظاہر نہ ہونے دیتے۔ایک تقریب میں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا: ''آپ اتنا کام کررہے ہیں مگر اپنا نام کیوں چھپاتے ہیں؟ لوگ تو تھوڑا سا کام کرکے بڑی بڑی تصاویر کھنچوانے بیٹھ جاتے ہیں۔آپ پورے ٹی بی وارڈ کو روزانہ کھانا دیتے ہیں اور ایک تصویر بھی نہیں بنواتے''۔

وہ بولے:''آپ بے فکر رہیں اللہ کے ہاں میری فوٹو بن رہی ہے۔وہ کہتے ہیں اس وقت تک خود کھانا نہیں کھا سکتا جب تک میں مریضوں تک خود کھانا نہ پہنچا دوں۔وہ گھر سے آم ٹھنڈے کرکے لاتے اور خود مریضوں میں بانٹتے۔ایک بار وہ خود نہیں آئے بلکہ ان کا بیٹا پھل لے کر آیا۔اس نے وارڈ میں داخل ہونے سے پہلے اپنے جوتے باہر اُتار دیئے۔میں نے کہا: یہ ٹی بی وارڈ ہے،آپ احتیاط کریں آپ کو جراثیم لگ سکتے ہیں۔وہ بولا:

’’میرے والد صاحب نے کہا ہے: وارڈ میں جوتے اتار کر جانا جیسے مسجد میں جاتے ہیں۔ آپ نے اس کام کو عبادت سمجھ کر کرنا ہے اور عبادت جوتے اُتار کر کی جاتی ہے‘‘۔

وہ تمام مریضوں کو پھل دیتے وقت ان کا شکریہ ادا کرتا کہ وہ ان کا بے حد ممنون ہے کہ انھوں نے اس سے پھل لے لیے۔

چند سالوں کے بعد میں لاہور میں ذہنی معذور بچوں کے لیے قائم سرکاری ادارے چمن میں آ گئی جو گرین ٹاؤن میں واقع ہے۔ شروع میں میں کافی پریشان رہی کہ میں کیسے ان بچوں کو ہینڈل کر پاؤں گی۔ بعد میں مَیں نے اپنی سوچ کا زاویہ درست کیا اور ان بچوں کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہ تو وہ بچے ہیں جن کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ یہ جنتی ہیں اور جنتی بچوں کے ساتھ کام کر کے ہمیں اچھا لگے گا۔ پھر میں نے ان کے بارے میں سوچنا شروع کیا کہ انھیں کوئی نہ کوئی ہنر سکھایا جائے۔ ان کو کسی کا مددگار بنا دیا جائے۔ جیسے صفائی کے بعد ڈسٹنگ کرنا، مالی کا کام، سائیکل کو پنکچر لگانا، لائبریری میں کوئی ہیلپر، یا کسی دکان پر سیلز مین کے مددگار کے طور پر کام کر سکتے ہیں لیکن میں زیادہ عرصہ وہاں نہ رہی اور ۱۹۹۹ء میں میری تعیناتی انمول کینسر ہسپتال میں ہوگئی۔

انمول میں اکثریت مسافر، مسکین مریضوں کی ہے۔ سبھی مدد کے مستحق ہیں۔ ہمارے ادارے میں اگر کبھی آپ کو آنے کا اتفاق ہو اور آپ تین چار مریضوں کے حالات معلوم کر لیں تو آپ خود بخود ہمارے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ ہر مریض کی اپنی ایک کہانی ہے۔

میرے پاس ایک مریضہ آئی، اسے بریسٹ کینسر تھا۔ اس کا اپنا کوئی بچہ نہ تھا، اس نے بہن کا بچہ گود میں لے لیا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی بچی بھی دے دی مگر کینسر کی وجہ سے اس کا خاوند اس سے دُور رہنے لگا۔ سسرال والوں نے اس سے اس کی بچی چھین لی اور اس کی دیورانی کو دے دی۔ اس کی موجودگی میں وہ کھانا نہیں کھاتے تھے۔ اس سے نفرت کے باعث اس سے دُور رہتے۔ آخر ساس نے اسے میکے بھیج دیا کہ ماں کے گھر جا کر رہو۔ جب ٹھیک ہو جاؤ گی تو آ جانا۔ مگر بچی اس سے چھین لی گئی۔ بچی کے لیے اس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بچی کو دیکھنے کے لیے سسرال کے گھر کے دروازے کے باہر جا کر بیٹھی رہتی کہ شاید اسے بچی کی جھلک نظر آ جائے۔

انہی دنوں وہ انمول میں علاج کے لیے داخل ہوئی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ نہیں چاہتی کہ اس کی بچی اس کی دیورانی کے پاس رہے۔ وہ چاہتی ہے بچی کی پرورش اس کی خالہ کرے مگر یہ سب کہنے کی ہمت نہ تو اس میں تھی اور نہ ہی اس کی بہن میں۔ اس کے کینسر کی آخری سٹیج تھی۔ اس کی وفات سے پانچ چھ روز پہلے میں نے اس سے کہا اپنے شوہر سے کہہ دو جو تم چاہتی ہو پھر شاید تمھیں اس کا موقع نہ ملے۔ آخر اس نے ہمت کر کے اپنے شوہر سے کہہ دیا۔ میں نے بھی اس کے شوہر سے کہہ سن کر اس کی بچی خالہ کو دلوا دی اور پھر اس کا انتقال ہو گیا۔

اسی طرح ایک لاوارث مریضہ کی داستان ہے جسے جنرل ہسپتال والے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ اسے بڑی آنت کا کینسر تھا، سٹول بیگ لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے کوئی عزیز رشتہ دار نہ تھے۔ میں نے براہِ راست اس سے کچھ نہ پوچھا کہ اس کا دل دکھے گا، صرف یہی پوچھا: ’’شہناز تمھیں کون ملنے آئے گا تو اسے مل کر تمھیں خوشی ہوگی؟‘‘ اس نے جواب دیا: کوئی ہوتا تو آنہ جاتا۔

اسے موت کا بے حد خوف تھا۔ دروازے بند نہیں کرنے دیتی تھی۔ میں اس کا سٹول بیگ صاف کرتی، اس کی دل جوئی کرتی۔ رمضان کا مہینہ تھا، اس کا دل چاہتا کہ کوئی ہر وقت اس کے پاس بیٹھا رہے مگر کون بیٹھتا، کون اس کی باتیں سنتا۔ لوگ کہتے ہیں رمضان کا مہینہ ہے، ہمیں قرآن پڑھنا ہے، تراویح پڑھنی ہے، دورۂ قرآن اٹینڈ کرنا ہے مگر میں کہتی ہوں اگر کسی لاوارث مریض کے پاس بیٹھ کر اس کی دل جوئی کر لی جائے تو وہ شاید ان تمام عبادات سے بڑھ کر ہو۔

رمضان میں اس کی موت واقع ہوئی۔ مجھے فون آیا کہ ہسپتال والے گھبراتے ہیں ایسی میت کا کیا کریں؟ کسی نے کہا: ایدھی والوں کو دے

دیں۔ایدھی والوں کو فون کیا گیا۔انھوں نے کہا: پہلے پولیس میں رپورٹ درج کروائیں پھر ہم میت لے کر جائیں گے۔میں نے سوچا اگر انمول میں پولیس آ گئی تو وہ لوگ آئندہ لاوارث مریضوں کو داخل نہیں کریں گے لہٰذا ہم نے سوچا ہم خود ہی اس کے کفن دفن کا انتظام کریں۔اس سلسلے میں میرے بھانجے نے میرا ساتھ دیا۔ جب قبر کے لیے قبرستان گئے تو انھوں نے کہا: یہاں کے ناظم سے اجازت لے کر آئیں، علاقے کی نشاندہی کریں۔ہم رات بارہ بجے ناظم سے اجازت لینے گئے۔صبح انمول کے تمام ڈاکٹرز اور سٹاف سے استدعا کی کہ وہ نمازِ جنازہ پڑھیں۔یوں انمول کی قریبی کالونی میں نمازِ جنازہ ادا ہوئی اور میت کو دفنا دیا گیا۔

ہم نے غریب مریضوں کے لیے مختلف شعبے اور اکاؤنٹ بنا رکھے ہیں مثلاً دوائیوں کا شعبہ ہے جو لوگ دوائیوں کے لیے عطیات دیتے ہیں، نقد رقم کی صورت میں یا کسی اور شکل میں، ہم ان سے دوائیاں خریدتے ہیں۔لیوکیمیا اکاؤنٹ Leukemia Treatment یعنی خون کے کینسر والے مریضوں کی امداد کے لیے ہے۔ایسے بچوں کو ہم ایڈاپٹ کر لیتے ہیں۔لیوکیمیا کے مریض پر آٹھ سے دس لاکھ روپے تک خرچ آتا ہے اور چار پانچ سال میں مریض بالکل تندرست ہو جاتا ہے۔ایسے مریض کے علاج پر ۲۰ فیصد گھر والے خرچ کرتے ہیں اور ۸۰ فیصد ہسپتال دیتا ہے۔بعض اوقات مریض کے گھر کے حالات پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ وہ کتنا خرچ کر سکتے ہیں۔

ایک پین کلر اکاؤنٹ (Painkiller account) ہے۔کینسر کا مریض شدید تکلیف میں ہوتا ہے،اس کی تکلیف کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔نہ تو مریض بتا سکتا ہے کہ اسے کتنا درد ہے۔وہ صرف چیخ چلا کر ہی اپنی تکلیف کا اظہار کر سکتا ہے اور نہ ہی تیماردار جانتا ہے کہ اس کے درد کا مداوا کیسے ہوگا۔ہم ہر کسی کو پین کلر مفت دیتے ہیں جب کہ باقی دوائیوں میں کچھ مہنگی اور کچھ سستی ہوتی ہیں۔مارفین ہم آخری سٹیج پر دیتے ہیں،اس سے مرض کی شدت میں کمی ہو جاتی ہے۔ان دو دوائیوں کی مریضوں کو اشد ضرورت ہے۔میری حکومتِ وقت سے اپیل ہے کہ وہ یہ دوائیاں ہسپتالوں کو بروقت بہم پہنچانے کا اہتمام کریں۔

1- Fentanyl Transderwal Patches

2- Morphine Sulphate MR 30mg (magnus MR)

ری ہیبی لیٹیشن کا شعبہ (Rehabilitation Unit) اس شعبہ میں مریض کے ساتھ آئے ہوئے تیمارداروں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی مہارت کو بروئے کار لا کر پیسے کمائیں اور اس رقم سے اپنے مریض کا علاج کروائیں۔اگر انھیں سینا پرونا، کاڑھنا، سویٹر بُننا، کروشیہ بنانا آتا ہے تو ہم انھیں کپڑا، دھاگے، سوئی، اُون وغیرہ مہیا کرتے ہیں۔اگر کوئی مریض اس قابل ہے تو اسے بھی کچھ نہ کچھ تیار کرنے کو کہا جاتا ہے۔اس طرح مریض کا دھیان اپنی بیماری سے دُور رہتا ہے اور اسے اس کی محنت کا معاوضہ بھی مل جاتا ہے۔

انمول ہاؤس: کسی مخیّر نے اپنا گھر انمول کے لیے عطیہ کیا ہے۔وہ مریض جنھیں وارڈ میں جگہ نہیں ملتی یا ان کے تیمارداروں کو لاہور میں کہیں رہنے کا ٹھکانہ نہیں ملتا وہ لوگ یہاں رہتے ہیں۔یہاں پر رہائش کھانا پینا سبھی کچھ مفت ہے۔پہلے مریضوں کے رشتہ دار داتا دربار جا کر رہتے تھے۔وہاں ان کی جیبیں کٹ جاتی تھیں یا ان کی لڑکیاں اغوا ہو جاتی تھیں۔غربا کئی طرح کے مسائل کے شکار تھے۔انمول ہاؤس نے ان کا یہ مسئلہ حل کر دیا ہے۔گھر کی مالکہ کی طرف سے تین وقت کے کھانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔

Diet Facility for Indoor Patients: یہ شعبہ داخل مریضوں کو کھانا مہیا کرنے کے لیے ہے۔غریب مریض اچھا کھانا کھانے کی سہولت نہیں رکھتے جو ان کی صحت کے لیے ضروری ہوتا ہے۔فروری ۲۰۰۱ء سے ہم تمام مریضوں کو تین وقت مفت کھانا دیتے ہیں۔ناشتے میں انڈے، دودھ، مکھن، ڈبل روٹی بن وغیرہ اور کھانے میں گوشت، چکن، قیمہ، دالیں، سبزیاں، چاول، سویٹ ڈش، پھل اور مشروبات شامل ہیں۔اس کے علاوہ

دو وقت چائے اور دس بجے دودھ دیا جاتا ہے۔

ماہِ رمضان میں ہسپتال کے مریضوں اور ان کے رشتہ داروں اور اب کچھ عرصہ سے ہسپتال کے سٹاف کو بھی سحری وافطاری کرواتے ہیں کیونکہ سٹاف کے لوگ کچھ عرصہ سے ہمیں کہہ رہے تھے کہ آپ کی افطاری کی بہت خوشبو آتی ہے اس لیے اب ہم نے انھیں بھی افطاری میں شامل کرلیا ہے۔ سحری میں بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔عموماً سحری میں سالن روٹی کے ساتھ دہی اور چائے ہوتی ہے۔افطاری میں سموسہ، دودھ، کھجور، پھل، کھانے میں چکن، سبزی، چاول، روٹی، کھیر حلوہ شامل ہیں۔

اس کے علاوہ رمضان میں ہم ضرورت مند مریضوں کو راشن کا پیکٹ، نیا سوٹ، چوڑیاں، ٹوپی، جائے نماز دیتے ہیں۔سحری پر یومیہ تین ہزار روپے اور افطاری پر دس ہزار خرچ ہوتے ہیں۔

مذہب کے ذریعے علاج: یہ بہت مؤثر علاج ہے۔اس سے مریض کو بیماری کے خلاف لڑنے میں طاقت اور حوصلہ ملتا ہے۔اس میں موضوع ہوتا ہے ''اللہ کیا چاہتا ہے!''۔

کینسر کی کئی اقسام اور مراحل ایسے ہیں جن میں شفایابی کا امکان نہیں ہوتا محض تکلیف کم کی جاتی ہے۔کینسر ایسا مرض ہے جس سے شفایاب ہونے کے لیے مریض کا زندگی کے بارے میں اپنا رویہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔اس طریقۂ علاج سے مریض وہ نفسیاتی اور روحانی طاقت حاصل کرتا ہے جو بیماری کا مقابلہ کرنے میں کام آتی ہے۔ایسے مریضوں کے گھر والوں کو بتایا جاتا ہے کہ ان کے لیے جنت میں باغات بن چکے ہیں یہ یقیناً جنت میں جائیں گے۔انھیں تسلی دی جاتی ہے کہ یہ اللہ کے بہت قریب ہیں ان سے اپنے لیے دعا کروائیں۔ان کی دعائیں اللہ تعالیٰ قبول کرتا ہے۔ان کے لیے دوسری دنیا میں بے شمار انعامات رکھ دیے گئے ہیں جو تکلیفیں انھوں نے دنیا میں جھیلی ہیں ان کے بدلے میں بے تحاشا نعمتیں ان کی منتظر ہیں۔یہ باتیں سن کر بعض اٹینڈنٹ اتنے افسردہ ہوجاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ کاش اس مریض کی بجائے وہ خود اس بستر پر ہوتے۔

''اُمید کا دن'' (Hope Day) بھی یہاں منایا جاتا ہے۔جو بچے لیوکیمیا کے علاج کے بعد بہتر ہو رہے ہوتے ہیں اس دن انہیں ہم بیمار بچوں سے ملواتے ہیں تاکہ بیماروں کو تسلی ہو کہ کچھ عرصے کے بعد وہ بھی ان کی طرح تندرست ہوجائیں گے۔

مریضوں کی کونسلنگ کی جاتی ہے جس سے ان کے اندر بیماری سے لڑنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور وہ جلد صحت یاب ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہمارا ایک شعبہ نمائش بھی ہے جس کے تحت سال میں دو دفعہ Exhibition کا اہتمام کیا جاتا ہے۔لوگ اپنے گھروں کا فالتو سامان، پرانی اشیا جس میں کپڑے، جوتے، پرس، فرنیچر، کراکری، ڈیکوریشن پیس غرض ہر وہ چیز جو استعمال کے قابل ہو اور بک سکتی ہو وہ ہسپتال کو عطیہ کردیتے ہیں۔اس نمائش میں تمام اشیاء کو بیچ کر ان سے حاصل ہونے والی رقم کو مریضوں کے علاج معالجہ پر خرچ کیا جاتا ہے۔

انمول میں سلے سلائے کپڑوں کی ایک دکان بھی ہے جہاں بالکل نئے کپڑے اور اچھی حالت والے کپڑے فروخت کیے جاتے ہیں۔یہاں پر زیر علاج مریض عورتیں بھی کپڑے سلائی کرکے دیتی ہیں۔

ہمارے اس ادارے کے بارہ ممبر ہیں۔انمول ہسپتال کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ابوبکر شاہد صاحب اس سوسائٹی کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ہمیں اپنے کام میں ان کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ہسپتال میں کام کرنے والے تمام افراد ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ہم نے مختلف شعبوں کی کمیٹیاں بنائی ہوئی ہیں۔ایک کمیٹی ہر مریض کے گھر جا کر تحقیق کرتی ہے کہ آیا یہ مریض مستحق ہے یا نہیں۔

ہماری ماہانہ میٹنگ ہوتی ہے۔میرے ساتھ جو خواتین کام کر رہی ہیں سب خالص اللہ کے لیے مصروفِ کار ہیں، کوئی اپنا نام ظاہر نہیں کرنا

چاہتا۔

مجھے گھر سے باہر کام کرنے میں ہمیشہ آسانی رہی ہے کیونکہ میرے شوہر کا مجھے مکمل تعاون حاصل رہا ہے۔انھوں نے مجھ سے وعدہ لیا ہوا ہے کہ میں نے تمھیں کام کرنے کی اجازت دی ہے اس لیے تمام کاموں کے اجر میں میرا آدھا حصہ ہوگا۔ میرا گھر کبھی ڈسٹرب نہیں ہوا۔ میرے پانچوں بچوں نے کمپیوٹر کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ایک بیٹا سوفٹ ویئر انجینئر ہے اور دوسرا الیکٹریکل انجینئر ہے۔ اب وہ سوئٹزرلینڈ سے پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔

میں نے اپنے گھر کے قریب گھروں میں کام کرنے والی ماسیوں کی لڑکیوں کے لیے سلائی سکول اور بچوں کے لیے ٹیوشن سنٹر بنایا ہوا ہے۔ سو روپے فیس ہے تاکہ آنے والے ذمہ داری سے پڑھیں اور کام سیکھیں۔

ایک حدیث پاک کا مفہوم کچھ یوں ہے: اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے پوچھیں گے کہ یہ مریض جب صحت مند تھا تو یہ کیا کیا کرتا تھا۔ فرشتے بتائیں گے یہ فلاں فلاں کام کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اس کے اعمال میں وہ سب کچھ لکھتے جاؤ کیونکہ اب یہ کمزور ہے، یہ سب کچھ نہیں کر سکتا۔

میری لوگوں سے اپیل ہے کہ ہمیں رضا کارانہ کام کرنے والے افراد چاہئیں جو اس کام میں ہمارے دست و بازو بنیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے۔

☆☆☆

مطالعہ گاہ

قانتہ رابعہ

میری لائبریری سے

کتاب کا نام: ۵۔اے ذیلدار پارک

مصنف: حفیظ الرحمٰن احسن

ناشر: البدر پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور

042-37245030

جی قارئین آج کسوٹی کھیلتے ہیں...... شخصیت کے کچھ پہلو ہیں: کوثر و تسنیم سے دھلی زبان، مجدد، مفکر، قائد، شخصی وجاہت کے ساتھ ساتھ علمی ذہانت کمال درجہ پر تھی۔ امت مسلمہ پر ان کا احسان تحریر کے ذریعہ یہ ہے کہ اپنی تمام صلاحیتیں اعلائے کلمۃ الحق کے لیے کھپا دیں، جو کہا سچ کہا جو لکھا سنہرے حرفوں میں سونے کے پانی سے لکھا...... صدیوں زمانہ ایسی نابغۂ روزگار ہستی کے لیے ترستا ہے پھر اللہ رب العزت سوئی قوم کو بیدار کرنے کے لیے، زمین پر بسنے والوں پر احسان کرتا ہے۔ الطاف گوہر نے عزیز جہاں کہا تو کسی نے مرد باصفا...... نعیم صدیقیؒ کے لیے شاہ بلوط تھا...... جس کی تحریر اذہان کو بدلتی تھی اس کی گفتگو کے کیا رنگ ڈھنگ ہوتے ہوں گے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ صفحہ نمبر بیس پر لکھا ہے:

''نماز فجر میں اس ایمان افروز اور حیات آفریں تلاوت کلام ربانی کا ایسا تابندہ نقش میری لوحِ قلب و ذہن پر مُرتسم ہے کہ آج تک اس کی تنویر مدھم نہیں ہوئی۔ منفرد انداز، ادائے دلپذیر، قوت تاثیر اس کی یہ شانِ جلال، اسلوب جمال ادائیگی الفاظ کا یہ دروبست کہ موتی پروئے چلے آ رہے ہیں۔ لہجے کا یہ نشیب و فراز کہ کبھی کوہِ فراز سے گرتی ہوئی ندی کی طرح رواں دواں اور کبھی میدان میں بہتے ہوئے دریا کا خرام نیاز لیے۔ بس

یوں تھا کہ کوئی شخص ملکوتی نغمہ سنا رہا تھا اور سارا عالم گوش بر آواز تھا۔ایک نور کی چادر ساری فضا پر تنی ہوئی تھی اور وہ سامع کے ساتھ دلوں کو بھی اپنے لطیف اور خوشگوار لمس سے ڈھانپ رہی تھی......''

آپ نے ابھی جو پڑھا قارئین یہ محاورۃً نہیں حقیقتاً سچ ہے...... بھلا یہ کس کی آواز تھی؟ کس کے بارے میں لکھنے کی قلم سعادت حاصل کر رہا ہے؟؟ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ...... یہ کتاب رسائل ومسائل قسم کی ہے لیکن ۵۔اے ذیلدار پارک کے بارے میں جاننے والے اس قطعہ زمین کی اہمیت سے آگاہ ہیں کہ بعد از نماز عصر سیدی وہاں پر عوام الناس سے ملتے اور ان کے سوالات کے جواب دیتے...... کتاب میرے ہاتھ میں آئی تو زیادہ تر مسائل کا (یا سوالات کا) تعلق اس وقت کے خراب (اب کیا ہیں؟؟) ملکی حالات سے تھا۔بالخصوص مشرقی پاکستان کے لمحہ بہ لمحہ بگڑتے حالات (بنگلہ دیش بننے کے بعد سدھر گئے؟) اشتراکی نظام، بھٹو کا سوشلزم کا نعرہ، تحدید ملکیت اور قادیانیت کے قانون، پاکستان کے آئین سے ہے......لیکن آپ کے لیے میں نے سیدی کی تفہیم القرآن یا ان آیات کی تفسیر جو لوگوں نے پوچھی، خود میرے لیے بہت معلومات افزا تھی، منتخب کی ہے...... پوری کتاب کے مطالعہ کے بعد جب دوبارہ کتاب کا ٹائٹل اور پھر اندر کا صفحہ دیکھا اور **ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیرا** دیکھی تو عش عش کر اٹھی۔سید مودودی کی اس گفتگو جو ۵۔اے ذیلدار پارک میں کی گئی کو پڑھنے کے بعد دشمن بھی ان کی ''حکمت اور حکیمانہ انداز'' کے قائل ہو جائیں گے۔

یاد رہے کہ ان عصری مجالس کی حیثیت کسی پریس کانفرنس یا خطاب عام کی نہیں تھی یہ ایک غیر رسمی اور نجی مجلس ہوتی جس میں ہر فرد اپنی الجھن مولانا کے سامنے رکھ کر سلجھا لیتا تھا۔ان ''عصری'' مجالس کے لیے عصر کے بعد کا وقت کیوں منتخب کیا گیا؟ مولانا مودودیؒ نے فرمایا ''اس کی خاص وجہ تو نہیں بس ایک زمانے سے طبیعت کا میلان چلا آ رہا ہے کہ نماز عصر سے نماز مغرب کے درمیان عام طور پر طبیعت لکھنے پڑھنے کے کام کی طرف آمادہ نہیں ہوتی اس لیے اس وقت کو میں نے ملاقاتوں کے لیے خاص کر لیا...... یاد رہے عصری مجالس عصر سے مراد زمانہ یا عہد نہیں بلکہ نماز عصر سے مناسبت کی بنا پر عصری مجالس کہا گیا۔

۳۰ دسمبر ۱۹۴۹ء کی تاریخ سے مولانا کے الفاظ منسلک ہیں ''میں سخت بدخواہ ہوں گا اگر لاگ لپٹ کے بغیر آپ کو صاف صاف نہ بتا دوں کہ آپ کی زندگی کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ میرے علم میں آپ کا حال اور مستقبل معلق ہے اس سوال پر کہ آپ اس ہدایت کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں جو آپ کو خدا اور اس کے رسولؐ کی معرفت ملی ہے...... جس کے تعلق سے آپ چاہیں یا نہ چاہیں اسلام کے نمائندے قرار پاتے ہیں اگر آپ اس ہدایت کی صحیح پیروی کریں گے تو مغلوبی اور مسکنت کے سیاہ بادل چھٹ جائیں گے آپ کی ساکھ اور دھاک دنیا پر بیٹھ جائے گی۔

قارئین اب آتے ہیں لوگوں کے سوالات اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے جوابات کی طرف۔

س: مولانا! امام غزالی نے لکھا ہے کہ دنیا میں سب سے بڑا بت جسے پوجا جاتا ہے وہ انسان کی ہوائے نفس ہے۔اس سے کیا مراد ہے؟

ج: آدمی اللہ کے قانون اور ہدایت کے مقابلے میں اپنی خواہش نفس کی پیروی کرے ہوائے نفس کو بت اس لیے کہا گیا ہے کہ اگر آدمی اپنی خواہش نفس کے سامنے جھک جائے تو وہ نفس کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے۔اور اس کی کوئی ایک شکل نہیں ہوتی۔اصولی بات سمجھ لیجیے کہ جب بھی آدمی جائز و ناجائز اور حرام وحلال کی تمیز سے بے نیاز ہو کر اپنے مقاصد پورے کرنے لگتا ہے تو وہ ہوائے نفس کی پیروی کرتا ہے۔

س: ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ **اختلاف امتی رحمۃ** میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔اس کا مفہوم کیا ہے۔ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے باہمی اختلافات ملی اتحاد کو پارہ پارہ کیے دے رہے ہیں۔

ج: اختلاف وہی باعث رحمت ہوتا ہے جو واقعتاً باعث رحمت ہو اور یہ اختلاف وہی ہو سکتا ہے جو علم کے ساتھ کیا جائے۔علم کے ساتھ جو

اختلاف کیا جاتا ہے وہ تحقیق حق اور ابطال باطل کی غرض سے کیا جاتا ہے اس کا محرک گروہی تعصب یا جہل اور بے علمی نہیں ہوسکتی ۔ یہ اختلاف باعث رحمت اس لیے ہے کہ اگر اس کا دروازہ بند کر دیا جائے تو سرے سے اجتہاد کا دروازہ ہی بند ہو جائے ۔

س: مولانا ! دعا کا بنیادی فلسفہ کیا ہے؟ کیا دعا کرنا ضروری ہے؟ اور کیا یہ سمجھنا درست ہے کہ اس کی حیثیت نفسیات میں Auto Suggestion کی سی ہے؟

ج: دعا کی حیثیت درخواست کی سی ہے اس کی بنیاد ہمارے عقیدے پر ہے کہ سارے اختیارات کا مالک اللہ ہے اور اس کی مشیت کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا ۔ بالفرض ہم علاج کروا رہے ہیں تو جب تک اللہ نہ چاہے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی ۔ اگر اسے صحت منظور نہ ہو تو ڈاکٹر درست تشخیص ہی نہ کر سکے گا اس لیے دوا کے ساتھ دعا کرنا ضروری ہے اسے Auto Suggestion کہنا یا سمجھنا درست نہیں ۔

اب قارئین صاحب تفہیم القرآن سے تفہیم القرآن کی روداد (کہ آپ کو بھی علم ہو یہ نسخۂ کیمیا ہم تک کیسے پہنچا)

س: مولانا ! تفہیم القرآن کی تصنیف وتالیف میں آپ کون کون سی تفاسیر کا مطالعہ کرتے ہیں اردو کی کوئی تفسیر بھی زیر مطالعہ ہوتی ہے؟

ج: تفہیم القرآن لکھتے وقت میں زمخشری، ابن کثیر، ابن جریر، جصاص اور ابن عربی کی تفاسیر کو بالالتزام دیکھتا ہوں یہ تفسیر کی امہات کتب ہیں اس لیے ان کے بعد کسی اور تفسیر کی طرف رجوع کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ کوئی اردو تفسیر میرے زیر مطالعہ نہیں ہوتی ۔

س: مولانا فقہی مسائل کے لیے آپ فقہ کی کون کون سی کتب کی طرف رجوع کرتے ہیں؟

ج: فقہی مسائل کے لیے مختلف فقہی مذاہب کی اپنی اپنی کتب دیکھتا ہوں ایک فقہ کے مسائل کو دیکھنے کے لیے میں دوسری فقہ کی کتب پر انحصار نہیں کرتا بلکہ براہ راست فقہ کی بنیادی کتب کا مطالعہ کرتا ہوں ۔ میری رائے میں علمی تحقیق کے لیے بنیادی ماخذ کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے ۔

س: مختلف تفاسیر اور فقہی کتب سے استفادے کی کیا صورت اختیار فرماتے ہیں؟

ج: کسی سورت کی تفسیر کرتے وقت میں جن تفاسیر، فقہی ماخذ اور دوسری کتب کا مطالعہ کرتا ہوں ان کے نوٹس الگ الگ کاغذات پر لے لیتا ہوں تفسیر لکھتے وقت یہی کاغذات میرے سامنے ہوتے ہیں اس طرح اصل کتاب کو بار بار دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ۔

س: اس طرح نوٹس لینے میں تو بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہوگا؟

ج: عملی تجربے سے میں نے اس بات کو مفید پایا ہے کہ اشارات الگ نوٹ کر لیے جائیں ۔ اس میں وقت کم صرف ہوتا ہے اور سہولت ملتی ہے ۔

س: روزانہ اوسطاً کتنا وقت تصنیف وتالیف میں صرف فرماتے ہیں؟

ج: اوسط وقت کا تعین کرنا تو بہت مشکل ہے بعض اوقات سارے دن میں ایک لفظ لکھنا بھی ممکن نہیں ہوتا بعض ایسے کام پڑ جاتے ہیں یا ملاقاتوں میں اتنا وقت صرف ہو جاتا ہے کہ کام نہیں ہو پاتا ۔ یہ چیز میرے لیے سخت ذہنی کوفت کا باعث ہوتی ہے تاہم کوشش یہ کرتا ہوں کہ جس حد تک ممکن ہو اور صحت اجازت دے اس کام کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت نکالوں ۔

(اب بڑے لوگوں کی بڑی باتیں) بہرحال میں نے اپنے وقت کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے تین حصوں سے مراد برابر کے حصے نہیں وقت کی کھلی تقسیم مراد ہے ۔ ایک حصہ روزمرہ کے ملکی اور جماعتی مسائل کے لیے ہے (جس کی کتاب میں بار بار تفصیل دی گئی ہے اور آج بھی فٹ بیٹھتی ہے) ایک حصہ موجودہ نسل کے لیے ہے اور ایک حصہ ہماری آئندہ نسل کے لیے ...... تفہیم القرآن کی تصنیف میرے نزدیک مجھ پر آئندہ نسل کا حق ہے جسے میں موجودہ نسل کے لیے قربان نہیں کرنا چاہتا ۔

س: مولانا آپ کی تحریروں میں زبان و ادب کا اعلیٰ نمونہ موجود ہے تاہم انگریزی الفاظ کا استعمال کھٹکتا ہے کہ جن کا متبادل اردو میں موجود ہوتا ہے آپ وہاں انگریزی کا لفظ کیوں لکھتے ہیں؟

ج: زبان کے معاملے میں، میں پوری طرح دہلوی ہوں اور غلط زبان لکھنے کو سخت ناپسند کرتا ہوں البتہ میرے پیش نظر زبان سے زیادہ وہ مقصد ہوتا ہے جس کے لیے تحریر کو ذریعہ اظہار بناتا ہوں جب محسوس کرتا ہوں کہ کسی خاص مقام پر کوئی انگریزی لفظ میرے مدعا کو زیادہ موثر طریقے سے ادا کر سکتا ہے وہاں استعمال کر لیتا ہوں لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ لندن سے واپسی سے قبل ہلٹن ہوٹل کے خطبہ استقبالیہ میں میں نے ایک لفظ انگریزی کا استعمال نہیں کیا میں نہیں چاہتا کہ یہاں کوئی شخص یہ تاثر لے کہ اردو انگریزی زبان کا محتاج ہے......

تفہیم القرآن کے متعلق مزید تفصیلات سے پہلے چند جوامع الکلم...... پڑھیے اور سر دھنیے۔

۱۔ آدمی مطلق العنان ہونے کے بعد آدمی کہاں رہتا ہے؟ جو دوسروں کے ساتھ آدمیت سے پیش آ سکے!!

۲۔ حکمت کا اصل معیار قرآن و حدیث ہیں اور جو چیز ان کے خلاف ہو وہ حکمت نہیں ہو سکتی۔

۳۔ فتنہ تو تھوڑے علم سے ہی پھیلتا ہے علم جتنا کم ہوگا فتنہ اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔

۴۔ جس دنیا میں آپ رہتے ہیں اس میں صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

کتاب میں سوالات تو دلچسپ ہیں ہی اصل بات جواب کی ہے جن کو پڑھتے ہی ذہن کی گرہیں کھل جاتی ہیں اور بسا اوقات ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی ہے مثلاً ایک نوجوان کا سوال کہ ہمیں ضرورت تو غلے اور غذا کی ہوتی ہے ہم اللہ سے بارش کی دعا کیوں کرتے ہیں؟

جواب مفصل ہے پڑھنے سے (خود) تعلق رکھتا ہے لیکن اختتام اس فقرہ پر ہوتا ہے، مثلاً ایک آدمی کو اولاد کی خواہش ہو تو وہ شادی کرتا ہے اگر وہ شادی کے بغیر ہی اللہ سے بچے کی دعا کرے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا...... اولاد تو شادی ہی کے ذریعے حاصل ہوگی۔

کالم کے لیے بہت سے انڈر لائن کیے سوالات جگہ کی کمی کی بنا پر تحریر نہیں ہو پائیں گے تاہم تفہیم القرآن کی تکمیل کا آنکھوں دیکھا حال......

یہ ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ (۷ جون ۱۹۷۲ء) کا دن تھا جب مرکز کے جواں سال کارکن محمد انور کا کہنا ہے کہ تفہیم القرآن مکمل ہو گئی ہے...... اس روح پرور خبر کو سنتے ہی ٹائم پیس پر نظر پڑی تو ایک بج رہا تھا۔ نماز مغرب کے بعد مولانا کے دفتر میں مبارکباد پیش کرنے والوں کا مجمع تھا جس میں ہر عمر کے افراد تھے ایک صاحب کی تجویز تھی کہ تفہیم القرآن کی تکمیل کی خوشی میں بڑے پیمانے پر تقریب مسرت ہونی چاہیے جس میں عالم اسلام کی سربرآوردہ شخصیتیں بھی شریک ہوں۔ مولانا نے ارشاد فرمایا:

''میرے نزدیک اہم چیز یہ ہے کہ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول کرے'' ایک نوجوان نے کہا ''مولانا جب تفہیم القرآن کی تکمیل ہوئی تو آپ کو بڑی مسرت ہوئی ہوگی؟'' مولانا نے آہستگی سے فرمایا ''میری تو تمنا پوری ہو گئی ہے۔''

ایک سوال تھا ''جب آپ نے اس مقدس کام کا آغاز کیا تو آپ کا کیا اندازہ تھا کہ کتنے عرصہ میں مکمل ہوگی؟'' جواب پڑھیے۔ اس کا مطلق اندازہ نہ تھا اگر آغاز ہی میں ''ترجمان القرآن'' میں تفہیم کی اشاعت کا سلسلہ شروع نہ کیا ہوتا تو دوسری مصروفیات مجھے شاید اس کی تکمیل نہ کرنے دیتیں۔ اس کی ماہانہ اشاعت سے یہ ایسی ذمہ داری بن گئی جسے میں ہر ماہ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر نبھاتا چلا گیا۔

قارئین کتاب میں زیادہ اہم موضوعات جن کو چھیڑا تک نہیں گیا وہ ''اشتراکیت، مولانا کا بغرض علاج لندن میں قیام، مشرقی پاکستان کے

بگڑتے حالات اور سید مودودی کا دورۂ مشرقی پاکستان، جماعت اسلامی کا سیاسی اور معاشی پروگرام، کچھ خطابات، لوگوں کے نفسیاتی مسائل وغیرہ ...... چلتے چلتے ''مولانا شہید لفظ کا کیا مفہوم ہے اور اس کا اطلاق کن لوگوں پر ہوتا ہے'' کا جواب پڑھ لیجیے۔

''یہ ایک اسلامی اصطلاح ہے جس سے مراد وہ شخص ہے جو خدا کے دین کی حمایت میں لڑتا ہوا مارا جائے ایسے شخص کو شہید نہیں کہا جائے گا جو کسی بھی مقصد کی خاطر اپنی جان قربان کر دے......''

آخر میں لوگوں کے مغلظات بکنے پر سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ردعمل۔ کیا آپ کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ آپ اپنے مخالفین کی گالیوں پر صبر کر کے دراصل انبیاء علیہم السلام کی سنت پر عمل پیرا ہیں آپ کے مخالفین آپ کے ساتھ یہ طرز عمل اختیار کر کے اس بات کی رسید دیتے ہیں کہ آپ جس دعوت کو لے کر اٹھے ہیں وہ عین حق ہے اور اس کے مقابلہ میں ان کے پاس صرف جھوٹ اور اخلاقی پستی ہے۔ میں نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ ان لوگوں کی کسی گالی، الزام یا بہتان کا جواب نہیں دوں گا اور میں جانتا ہوں کہ میں جھوٹ اور گالیوں کے جواب میں خاموشی اختیار کر کے گھاٹے کا سودا نہیں کر رہا......''

لیجیے قارئین آج کا کالم اختتام کو پہنچا۔ میری اس درخواست کے ساتھ کہ کتاب خریدیے اس طرح کتاب پڑھنے کا زیادہ مزہ آئے گا...... فی امان اللہ......

☆......☆......☆

خفتگانِ خاک

شیخ راحیل وارث

وہ امانت کا رکھوالا

اس جری جوان کی یاد میں جسے دریائے کنہار کی ظالم موجیں آن کی آن میں نگل گئیں اور کنارے پر کھڑے لوگ آج تک منتظر ہیں

موبائل چیخ چیخ کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا اور بار بار ایک ہی التجا کر رہا تھا کہ مجھے فوراً اٹینڈ کر لو بالکل ایسے ہی جیسے ایک ضد کرتا، روتا بلکتا، چیختا چنگھاڑتا بچہ ماں کی آغوش میں آنے کو بے تاب ہوتا ہے اور جیسے ہی ماں اسے اپنی گود میں اٹھاتی ہے وہ فوراً چپ ہو جاتا ہے۔ خیر...... بھاگ کر فون اٹینڈ کیا تو خبر سنتے ہی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر بہہ نکلا جو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرا جسم تو ہے مگر روح و جان سے خالی ہو گیا۔ خبر تھی ہی ایسی اندوہناک، بھیانک جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دل اسے کسی صورت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ اور تڑپتے ہوئے، زخمی، بے بس ولاچار دل کی تمنا، خواہش، آرزو اور دعا یہی تھی کہ یا اللہ تو میرے باہمت، جرأت مند، حوصلہ مند، شجیع و بہادر نصر اللہ بھائی کی حفاظت فرما۔ انھیں اور حافظ سفیان عاصم کو اپنی رحمت کے دامن میں چھپا لے، انھیں ہم گناہ گاروں کے ساتھ عافیت و خیر کے ساتھ واپس لا ملا۔

حقیقت یہی ہے کہ وہ شخص کہ جس سے میرا دور پرے کا بھی کوئی واسطہ یا رشتہ نہ تھا، جس سے میرا کبھی ملاقات یا گفتگو کرنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا آج اس کے بارے میں یہ خبر سن کر میں تڑپ اٹھی تھی اور دل بار بار یہ گواہی دے رہا تھا کہ میرا اور اس کا رشتہ ہے خونی نہ سہی مگر ایسا رشتہ جو

انمٹ ہوتا ہے، جو سب سے گہرا ہوتا ہے، جو محبت وخلوص کا رشتہ ہوتا ہے۔ مجھے آج احساس ہو رہا تھا کہ نصر اللہ بھائی تو میرے بڑے بھائی ہیں۔ ان کی عزت تو تبھی سے دل میں گھر کر گئی تھی جب جلسے میں انھیں تقریر کرتے سنا، پھر بھائی کو جماعت کی ریلیوں، دھرنوں میں ماشاءاللہ جان دار، گرج دار اور خوبصورت آواز میں نعرے لگاتے سنا۔ بارہا ان کی تقریریں سنیں جو ان کی عاجزی وانکساری کا ثبوت پیش کرتی ہیں، ان کی سادگی، اخلاق، لب ولہجہ ان کی بہترین تربیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

نصر اللہ بھائی جو اسکول کے پرنسپل تھے۔ دریائے کنہار میں اپنے شاگرد حافظ سفیان کو بچانے کے لیے اپنی جان کی پروا کیے بغیر کود گئے۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ یہ سوال بہت سی زبانوں پر ہے اور کچھ لوگ تو اسے حماقت ہی قرار دیتے ہیں کہ وہ ایسا نہ کرتے تو بچ جاتے اور ایسا کرتے تو ایسا نہ ہوتا۔ جبکہ حدیث نبویؐ ہے کہ: ''اپنے فائدے کی چیز حاصل کرنے کے لیے تدبیر کرو اور اللہ سے مدد مانگو، ہاتھ پاؤں چھوڑ کر مت بیٹھو، اس کے باوجود اگر تمھیں نقصان پہنچ جائے (تو صبر کرو) یہ نہ کہو کہ اگر میں ایسا کر لیتا تو ایسا ہو جاتا اور مجھے نقصان نہ ہوتا بلکہ یہ کہو کہ اللہ نے مقدر کیا تھا جو اللہ نے چاہا ہو گیا اس لیے کہ ایسی تمنائیں شیطان کے لیے دروازہ کھول دیتی ہیں۔''

نصر اللہ بھائی نے انتہائی عقلمندی، جرأت اور دانائی کا ثبوت سفیان کو بچانے کے لیے دریا میں کود کر پیش کیا۔ وہ تو بہادر، جی دار شخص ہے اسے اس وقت دریا کی تیزی سے ڈر نہیں لگا بلکہ خوف تھا تو خوفِ الٰہی جو دل میں رچا بسا ہوا تھا نہ کہ جان کے جانے کا خوف اسے لاحق تھا۔ اگر آرزو تھی تو شہادت کی نہ کہ لمبی عمر پانے کی، اگر اسے لالچ تھا تو نیکی میں سبقت لے جانے کا (ڈوبتی جان کو بچانے کی نیکی) نہ کہ دنیاوی مال ومتاع حاصل کرنے کا۔ اس کو تو اللہ کی ذات پر پورا بھروسا، کامل یقین اور اعتماد تھا کہ وہ ان کی اس کوشش کو رائیگاں نہیں جانے دے گا۔ اسی لیے یہ انتہائی قدم انھوں نے اٹھایا جو صرف ماں یا باپ ہی اٹھا سکتے ہیں لیکن چونکہ وہ اپنے اس شاگرد کے روحانی باپ تھے اس لیے صبر نہ ہوا اور بغیر کسی کو مدد کے لیے پکارے تن تنہا ہی دوڑ کر اس نیکی میں سبقت لے جانے کے لیے دریا میں کود پڑے۔

نصر اللہ بھائی کے ساتھ چوبیس لڑکے پاکستان کے تفریحی ٹور پر نکلے تھے یعنی چوبیس بھاری ذمہ داریاں، چوبیس امانتیں تھیں جن کے امیر وہ تھے، جن کے نگہبان ورکھوالے وہ تھے۔ سفیان دریا میں جب ڈوبنے لگا تو نصر اللہ بھائی کیسے برداشت کرتے کہ ان کے ذمہ دی گئی امانت کے معاملے میں دریا خیانت کر جائے اور وہ تماشائی بنے دیکھتے رہیں۔ انھیں بھاری احساسِ ذمہ داری تھا جس کے تحت انھوں نے سفیان کو بچانے کے لیے جان کی بازی تک لگا دی اور جان سے بڑھ کر اور کیا شے قیمتی ہے!

☆......☆......☆

انشائیہ

کچھ تو اِدھر بھی

شمیم فاطمہ

فواروں کی طرح اُبلتے چشموں کا پانی پھوار بن کے برس رہا تھا...... ہوائیں گنگنا رہی تھیں...... گھنے سرسبز درختوں کے سائے...... رسیلے پھلوں کے بوجھ سے جھکی ڈالیاں...... ٹھنڈے پانی کی نہریں...... بکثرت پھل، کھجوریں، انار...... انگور کے خوشے...... آراستہ وپیراستہ محلات...... سرسراتے لہراتے ریشمی پردے...... دبیز ریشم کے گداز قالین...... مخملیں گاؤ تکیے...... سونے چاندی کے شیشے جیسے شفاف ظروف...... ہاتھوں میں شرابِ طہور کے

جام، سبز ریشمی لباس میں ملبوس آبدار موتیوں جیسے معصوم لڑکے...... ہمنشینی کے لیے بلا کی حسین وجمیل، انڈے کے چھلکے جیسی شفاف نرم جِلد والی، بلوریں آنکھوں والی، حیادار، شرمیلی، ہم سن حوریں...... حریر واطلس و دیبا کے پیرہن پہنے...... مسندوں پہ محوِ استراحت...... سونے کے کنگنوں سے آراستہ ہاتھوں میں جام لیے...... شاداں وفرحاں ومسرور...... خوش گپیوں میں مصروف اہلِ جنت کو دفعتاً اُن دوستوں، عزیزوں کا خیال آتا ہے جو انھیں یہاں اس سرسبز زمین، اس آراستہ وپیراستہ محل سرا میں کہیں دکھائی نہیں دے رہے...... ''آخر وہ کہاں ہیں......؟؟'' (وہ جو پچھلی عمر میں ساتھ تھے وہ کہاں گئے؟؟)

معاً ان کی نظروں کے سامنے ایک دشتِ آتش ناک نمایاں ہو گیا...... بھڑکتی ہوئی آگ...... اُٹھتے ہوئے شعلے...... دھواں، تپش...... آہ و بکا...... چیخ و پکار...... کھال جلنے کی بُو...... جس میں جھلسے ہوئے چہروں...... اُدھڑی ہوئی کھالوں کے ساتھ نا قابلِ برداشت اذیت کو سہتے ہوئے حسرت و یاس کے مارے لوگ!! مسرور وشاداں افراد دلوں پر ہاتھ رکھ لیں گے...... اُف! اس قدر اذیت بھی......!! الٰہی! ایسے عذاب میں!!...... (نہیں! ان کا حال تو ہم سے دیکھا نہیں جاتا......!) بے اختیار پوچھیں گے: ''تمھیں کیا چیز یہاں لے آئی؟'' ...... جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا کی مجسم تصویر بنے وہ قیدی بڑی حسرت سے جواب دیں گے کہ ''ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے......''

☆☆☆

یہ جو الگ الگ مقام ہے! یہ جو الگ الگ طرزِ قیام ہے! یہ جو ایک طرف اعزاز و اکرام ہے، یہ جو ایک طرف ذلت و دشنام ہے...... یہ ہمارے اعمال ہی کا تو نتیجہ ہے...... ہم جونوری ہیں نہ ناری ہیں! نہ کاٹھ کے اُلّو ہیں...... نہ پتھر کے صنم ہیں...... نہ پانی کا بلبلہ ہیں...... نہ موم کا مجسمہ ہیں...... خاک سے بنائے گئے...... مٹی سے گوندھے گئے ہیں...... مٹی کے گوندھے جانے سے بکھر جانے کے درمیانی عرصے میں ہم اپنے مقدور بھر جو اعمال کر جاتے ہیں وہ ہمیں سُوئے جنت لے جاتے ہیں یا واصلِ جہنم کر دیتے ہیں۔

مٹی کے پتلے کو ایک مقررہ مدت تک زندہ رہنے کے لیے کچھ بنیادی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے...... رہنے کے لیے گھر کی...... کھانے کے لیے غذا کی...... پہننے کے لیے لباس کی......! انسان کی زندگی ان ہی تینوں چیزوں کی تلاش...... بہتر سے بہتر کی جستجو...... اس میں قابلِ قدر اضافے کی خواہش اور اس میں جدت طرزی کرتے گزر جاتی ہے...... یہاں تک کہ (کھیل ختم پیسہ ہضم!) امتحان گاہ میں وارننگ بیل (تنبیہی گھنٹی) بج جاتی ہے...... ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں...... امتحانی کاپی میں جواب ادھورے رہ جاتے ہیں...... مہلت ختم ہو جاتی ہے...... کاپی چھین لی جاتی ہے......!

اِس مٹی کی عمارت کو سینچنے کے لیے...... اس کے ستونوں کو کھڑا رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بھوک لگنے کا ایک خودکار نظام بنایا ہے۔ جوں ہی جسم کو توانائی کی ضرورت ہوتی ہے دل کچھ کھانے کی خواہش کرنے لگتا ہے...... ہمیں بھوک ستانے لگتی ہے...... ہم اس کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہیں...... (ارے آٹا تو ختم ہو گیا!...... چلو بازار جاؤ آٹا لاؤ...... پانی لاؤ آٹا گوندھو...... پیڑے بناؤ، بیلو، سینکو، روٹی پکاؤ، انھیں گرم رکھنے کا انتظام کرو...... کسی خوش ذائقہ سالن کو کسی خوش رنگ ڈونگے میں نکالو...... پھر ہپ ہپ کھاؤ...... بھوک مٹاؤ...... جان بناؤ!)

بھوک ایک فطری اور بنیادی ضرورت ہے...... نیشنل مصالحہ جات کی فیکٹری کے قیام سے صدیوں پہلے بھی انسان کو بھوک لگتی تھی...... بھوک ستاتی تھی (اور وہ سوچتا تھا کہ میں کیا کروں؟! میں کس کو کھاؤں؟؟) جب وہ غیر متمدن زندگی گزارتا تھا...... درختوں کے کھوہ میں پڑ کے سورہتا تھا...... درختوں کے پتوں سے تن ڈھانپ لیا کرتا تھا...... باٹا اور سروس کے جوتوں سے ناآشنا تھا یا بجولاں ہی چل پڑتا تھا...... نہ زلفیں تراشنے کو قینچی...... نہ صورت دیکھنے کو آئینہ!!...... گلاس میں پانی پینا جانتا تھا نہ رکابی میں کھانا کھانا!!...... اُس اُجڈ، غیر مہذب، غیر متمدن آدمی کو بھی بھوک لگتی تھی...... راہ میں کوئی شکار مل گیا...... مارا...... چیرا پھاڑا...... چبا لیا...... جو ہاتھ آیا اُٹھایا کھا لیا...... بھوک مٹ گئی...... جسم پل گیا۔

پھر جیسے جیسے انسان متمدن ہوتا گیا...... خوابوں کی تعبیریں ڈھونڈنے لگا...... ضرورت بڑھی...... ایجاد کا خیال آیا...... سلیقہ آنے لگا...... شعور

آنے لگا...... (دوکان سجانے لگا) من وسلویٰ سے اُکتا گیا...... کھیرا ککڑی، دال، ساگ، گندم اور چاول کی خواہش نے پھر مٹی سے جوڑ دیا...... کھیتی باڑی کرنے لگا...... مشینیں بنانے...... کارخانے لگانے لگا...... روٹی پکانے...... دسترخوان سجانے لگا...... پھر روٹی میں ورائٹی پیدا ہوئی...... چپاتی، تہہ دار، روغنی نان، تافتان، تندوری، شیر مال، کلچہ، کچوری، پوری، ڈبل روٹی، پیزا...... ایک خوشۂ گندم کو سو قالبوں میں ڈھالا جانے لگا...... کچھ نیا...... کچھ نرالا...... کچھ منفرد...... کچھ دیسی کچھ بدیسی...... کچھ بھوک تھی...... کچھ مجبوری تھی......! سو جا بجا...... کُو بہ کُو...... ہرسُو...... کھانے ہی کھانے...... کھانوں کے مراکز...... فوڈ اسٹریٹ، فوڈ پوائنٹ...... کے ایف سی...... میکڈونلڈ...... فوڈ میلہ...... مزیدار حلیم، پریمیئر بریانی...... چائنیز کھانے...... اٹالین ڈش...... چھولوں کے ٹھیلے...... چاٹ سینٹرز...... جاوید نہاری...... بُندو کے کباب وغیرہ وغیرہ...... یہ سارا پھیلاؤ کہتا ہے کہ (جو بھی کچھ ہے کھانے کا پھیلاؤ ہے......!!) ہم کھانے کے معاملے میں کس قدر حریص ہیں...... ہم کھانے کے کتنے شوقین ہیں...... (کہ جان جائے خرابی سے ہاتھ نہ اُٹھے رکابی سے......) ہم کھانے سے کتنی رغبت، محبت، دلچسپی رکھتے ہیں...... (کہ دل تک بھی معدے کے راستے ہی جاتے ہیں)۔ ہر دن کا آغاز ''آج کیا پکے گا؟'' کے سوال پر کرتے ہیں اور دن میں تین مرتبہ یہی سوال دہراتے ہیں...... ہر ویک اینڈ (ہفتے کا اختتامی دن) پر کسی فوڈ سینٹر پہنچ جاتے ہیں۔ اپنی حق حلال کی کمائی کا ایک معقول حصہ یہود و نصاریٰ پر لٹا آتے ہیں (یا فضول خرچ کر دیتے ہیں)۔ اس تعاون اور شراکت پر اتنے خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے چہرے سے خوشی ٹپکنے اور جھلکنے لگتی ہے...... دل مسرور ہوتا ہے کہ ہم کسی سے کم نہیں...... روزانہ کے دال روٹی سے تو آج نجات ملی...... آج تو کچن میں تپنے جھلسنے سے فرصت ملی...... آج تو جسمانی مشقت سے آرام ملا...... آج تو بچوں کا دل خوش کیا...... آج محسوس ہوا کہ آدمی اسٹینڈرڈ مینٹین رکھے تو سوسائٹی میں معزز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں جتنے بھی کھانا کھانے آئے ہیں ہم ان سے کچھ کم تو نہیں...... شکر ہے کہ ہم بھی معزز اور مقبول ہیں......!!

ہم کھانے کے شوقین...... ہم کھلانے کے شوقین...... دوست احباب کو، عزیزوں رشتہ داروں کو...... ان افراد کو جن سے کسی کام کے بننے کی توقع ہو...... سمدھیانے...... سسرالیوں کو...... ہم اپنا دسترخوان وسیع کرتے ہیں...... کئی اقسام کے سالن...... کئی اقسال کے چاول...... کم از کم دو طرح کی روٹیاں...... کم از کم میٹھے میں دو آئٹم...... کوئی مشروبِ مغرب...... کسر نہ رہ جائے...... مقدور بھر مدارت......! جیب پر اضافی بوجھ بھی سہار لیتے ہیں...... لیکن جو سوال کرتا ہے ہم اس کو نہیں کھلاتے...... جس کو میسر نہیں ہے ہم ان کو نہیں کھلاتے...... یتیموں، مسکینوں، اسیروں کو نہیں کھلاتے...... جی تو بہت چاہتا ہے مگر کیا کریں...... بچت ہی نہیں ہوتی...... (ہم اپنی طمع، اپنی ہوس، اپنی بھوک سے باہر نکلیں تو......! میں ایسے جمگھٹوں میں گھر گیا ہوں...... جہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے......! یہ جمگھٹا یہ گھیرا پھیلتا ہی جا رہا ہے، بڑھتا ہی جا رہا ہے، اپنی ضرورت ہی اتنی کشادہ اور وسیع ہوتی جا رہی ہے......)

ہم اپنی بھوک سے باہر نکلیں تو...... لقمہ اُٹھاتے ہوئے ہاتھ رُک جائے کہ کتنے بچے...... کتنے لوگ فاقے سے ہوں گے...... کتنے گھروں میں دسترخوان نہیں لگا ہوگا...... کتنے گھروں میں کھانا نہیں بنا ہوگا...... اس احساس سے لقمہ گلے میں پھنسنے لگتا ہے...... بھوک مٹ جاتی ہے، فکر لاحق ہو جاتی ہے...... ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے، کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے...... اور آگ کا سودا کر لیتے ہیں...... وہ کہتا ہے: ''بجھاؤ اس آگ کو کھجور کا ایک ٹکڑا دے کر ہی سہی''۔ جو اس کھانے سے رغبت، محبت، شوق، دلچسپی رکھنے کے باوجود اس کھانے میں سے یتیموں، مسکینوں، اسیروں محتاجوں کا حصہ نکالتا ہے...... جیسا خود کھاتا ہے ویسے ہی کھانے سے ان کی بھی تواضع کرتا ہے (اپنے غلاموں، یتیموں، مسکینوں، اسیروں کی) بچا کھچا...... باسی تو اسی، ایسا ویسا، کم درجے کا...... روٹی پر سالن رکھ کر...... بچے کھچے سالن کو مکس کر کے...... شاپر میں ڈال کر...... احسان جتاتے ہوئے نہیں کھلاتا...... جوابی دعوت کی نیت سے نہیں کھلاتا...... خراجِ تحسین طلب کرنے کے لیے نہیں کھلاتا...... کسی ممنونیت...... کسی شکریے کے لیے نہیں کھلاتا...... وہ تو اپنے آقا کی خوشی کے لیے کھلاتا ہے...... تو غیر معیاری کھانا...... غیر مہذب انداز میں...... کیسے کھلا سکتا ہے...... یا اُس کا آقا کیا کہے گا......!! کہ خود تو تکّہ، بروسٹ، باربی کیو بز...... اور میرے نام پر سوکھی چپاتی پر باسی سالن!! (واہ رے تیری تواضع! واہ رے تیری مہمانی!!) ہم نے اپنا آدمی تیرے پاس بھیجا اور تو نے اس

سے یہ حُسنِ سلوک کیا!! تو نے اس تکبر کے ساتھ انھیں کھلایا کہ یہ معاشرے کے نظرانداز شدہ افراد ہیں، کچلے ہوئے، روندے ہوئے، کم تر، حقیر...... (اس تکبر کے ساتھ تو فرعون بھی کھلایا کرتا تھا اس کے دسترخوان پر بھی بیک وقت ہزاروں افراد کھانا کھاتے تھے) تو میری محبت میں کھلا رہے ہو یا داد و تحسین کی طلب میں؟ اللہ تو محسنین کا قدردان ہے......کوئی کھا کھا کے نہیں تھک رہا ہے اور کوئی......دانے دانے کو ترس رہا ہے...... ادھر طمع بڑھی جا رہی ہے......اُدھر ضرورت پوری نہیں ہو رہی ہے......عزتِ نفس کا پرچم سرنگوں کیے چلی جا رہی ہے......!!

☆☆☆

ہلکا پھلکا

ڈاکٹر محمد ہمایوں

بات کا بتنگڑ

مانا کہ انسان حیوان ناطق ہے لیکن باتیں کرنا اور کرتے ہی چلے جانا، آخر کہاں کا انصاف ہے؟ ممکن ہے کہ حضرت انسان نے مصرع سن رکھا ہو کہ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔ چنانچہ بات سے بات نکلتی ہے اور نکلتی ہی چلی جاتی ہے کہ بات نہ ہوئی بلکہ شیطان کی آنت ہوئی۔ پھر کسی کی باتیں بھلی محسوس ہوتی ہیں تو کوئی سمع خراشی کا باعث بنتی ہیں؛ کسی کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں تو کسی سے انگارے۔ کوئی خوش ادا ہوتا ہے تو کوئی شعلہ نوا۔ زیادہ باتیں کرنے والے کو باتونی کہا جاتا ہے تو کم بولنے والے کو کم گو۔ حالانکہ اس سے go یا come کا کیا تعلق ہے! عام طور پر عورتوں کو باتونی کہا اور سمجھا جاتا ہے لیکن مرد بھی اس معاملے میں کچھ کم نہیں، اگر کوئی شک ہے تو پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کر کے دیکھ لیں۔

بول میں ایک حرف ڈالنے سے بھول بن جاتا ہے اور ان کا بھی آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مرد بات کرتے ہوئے بھول جاتا ہے کہ کیا بات کر رہا تھا اور عورت باتیں کرتے ہوئے یہ بھول جاتی ہے کہ کتنی دیر تک باتیں کرنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دکانداروں نے بھول چوک لینی دینی تو لکھا ہوتا ہے لیکن بھول چوک کہی سنی نہیں لکھتے۔ کہتے ہیں کہ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا افضل جہاد ہے لیکن جابر رانی کے سامنے نہیں۔ بصورت دیگر وہ اپنے قول و فعل کا خود ذمہ دار ہوگا۔ ویسے ہمارے ہاں تو شوہر اکثر صلح جو ہی واقع ہوئے ہیں، سوتے میں بولنا بھی ایک بیماری ہوتی ہے لیکن یہ عارضہ عام طور پر شادی کے بعد لاحق ہوتا ہے۔

کچھ تو صرف جھک ہی مارتے ہیں لیکن قیمتی آدمیوں کی باتیں بھی قیمتی ہوتی ہیں چنانچہ وکلاء اور ڈاکٹرز کی باتیں اتنی قیمتی ہوتی ہیں کہ عوام کی جیبیں اس سے ہلکی ہو جاتی ہیں۔ ویسے یہ بھی ایک نیکی ہی ہے ورنہ اس دور میں بھلا کون کسی کا بوجھ کم کرتا ہے۔ یوں تو اقوال زریں بھی بڑے قیمتی ہوتے ہیں لیکن یہ کہنے کیلئے ہم اپنے بزرگ ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔

بات کا بتنگڑ، آنکھ کا شہتیر اور رائی کا پہاڑ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، پہلے پہل ساس اور بہو بات کا بتنگڑ بنایا کرتی تھیں لیکن آج کل یہ کارِ خیر انکل سام نے اپنے ہاتھ لیا ہوا ہے اور اسی بہانے مختلف اسلامی ممالک میں خون کی ہولی کھیل چکا ہے۔

تمام مکتبہ فکر کے علمائے کرام اس بات سے متفق ہیں کہ چاہے جو کچھ بھی کھائیں، چپ کا روزہ اس سے نہیں ٹوٹتا۔ چنانچہ اس رعایت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر بعض لوگ چپ کا روزہ رکھ لیتے ہیں اور جب جی چاہے (خبروں کی زینت بننے کی خاطر) برسرعام توڑ بھی دیتے ہیں، اور ساتھ بیان بھی داغ دیتے ہیں کہ ملک کی تباہی پر زیادہ دیر خاموش نہیں رہا جا سکتا۔

بات کاٹنا اگرچہ معیوب فعل سمجھا جاتا ہے تاہم اس کے لئے کسی قینچی کی ضرورت نہیں (صرف زبان ہی کافی ہے)۔ دنیا بھی عجیب رنگ دکھاتی

ہے۔کہیں تو بات کاٹی جاتی ہے اور کہیں بات پکی کی جاتی ہے۔اور جہاں یہ حادثہ رونما ہو جائے تو پھر ساری عمر اسے باتیں سنی پڑتی ہیں۔کوئی تو بات کو طول دیتے ہیں اور کوئی کہتے ہیں کہ رات گئی بات گئی۔اور کوئی رات بھر قصہ سننے کے بعد پوچھتے ہیں کہ زلیخا عورت تھی یا مرد؟

ہمارے ہاں بجلی آئی گئی ہوتی ہے جب کہ کبھی کبھی بات بھی آئی گئی ہو جاتی ہے۔بعض لوگ بات کرتے ہوئے دور کی کوڑی لاتے ہیں،شاید قریبی دکانیں بند ہوتی ہونگی لیکن غور کیا جائے تو بات لاکھ کی،کرنی خاک کی والی صورتحال ہوتی ہے۔خلیل خان کی وجہ شہرت یہ تھی کہ وہ فاختائیں اڑایا کرتے تھے جبکہ ہمارے مردم خیز خطہ میں ایسے ماہرین موجود ہیں جو بات چٹکیوں میں اڑا دیتے ہیں۔دانتوں کے بھی بڑے فائدے ہیں،کوئی تو کھانا چبا چبا کر کھاتے ہیں تو کوئی باتیں چبا چبا کر کرتے ہیں۔اسی طرح کوئی سنی ان سنی کر دیتا ہے تو کوئی بات کرید کرید کر پوچھتا ہے۔گوالا دودھ میں پانی ملاتا ہے تو لوگ بات میں بات ملاتے ہیں۔حالانکہ ملاوٹ تو سب کے لئے جرم ہے۔کبھی کہا جاتا ہے یہ بات ذہن سے نکال دو اور کبھی کوئی بات ذہن میں ڈالی جاتی ہے۔البتہ بچوں کے ذہن میں کوئی بات ڈالنا یا نکالنا مشکل ہوتا ہے۔صرف گولی ہی کڑوی نہیں ہوتی بلکہ بات بھی ہوتی ہے۔اور کڑوی ہی نہیں بلکہ بعض کو دوسروں کی باتیں زہر لگتی ہیں۔پھر نہ جانے لوگ خودکشی کے لئے زہر کیوں کھا لیتے ہیں۔دو چار باتیں ہی سن لیا کریں۔بعض لوگ ایک ہی بات پر ٹھہر جاتے ہیں گویا بات نہ ہوئی بس سٹاپ ہوا۔

جب کسی سے بات کرنے کا جی نہ چاہے تو کہا جاتا ہے موڈ آف ہے لیکن جب خوشدلی سے کوئی بات کر رہا ہو تو کہتے ہیں کہ خوب چہک رہا ہے۔گویا کسی حال میں بھی لوگ خوش نہیں رہتے۔تاہم موڈ کا کیا پتہ کہ آن آف ہوتے ہوتے کہیں فیوز ہی نہ ہو جائے۔پھر بات وہی ہو کہ

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے　　　لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

کون کہتا ہے کہ منہ سے نکلی ہوئی بات اور کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آ سکتا۔بات کیلئے تو ٹیپ ریکارڈر ہی کافی ہے جبکہ تیر کے بارے میں یہ بہر حال پتہ ہونا چاہیئے کہ وہ کہاں گرا ہے۔آج کل موبائل کمپنیوں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے کہ وہ عوام کو بلوانے پر ہی تلی ہیں۔کسی کمپنی کا ارشاد ہے کہ سب کہہ دو،شکر ہے یہ نہیں کہا کہ سخت وسست کہہ دو۔ایک اور کا کہنا ہے کہ بولو ذرا کھل کھلا کے۔یہ تو وہی معاملہ ہوا کہ باکسنگ کے مقابلہ میں ایک شخص آواز لگا رہا تھا کہ مارو اسے،دانت نکال دو سارے۔کسی نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ وہ بولا میں دانتوں کا ڈاکٹر ہوں۔اب موبائل کمپنیاں لوگوں کو بولنے پر نہیں اکسائیں گی تو بھلا کیا دال بیچیں گی۔ویسے حکومت کو ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنی چاہیئے۔کیونکہ آج وہ عوام کو ویسے بولنے پر اکسا رہے ہیں تو کل وہ کسی کے خلاف بولنے پر بھی اکسا سکتے ہیں۔مشتری ہوشیار باش۔

بعض لوگ نہایت نازک مزاج ہوتے ہیں،ایک ہی طرح کی بات پر کھلکھلا کر ہنسنے لگتے ہیں اور اسی طرح کی بات پر سخت ناراض ہو جاتے ہیں۔اس لئے آدمی ان سے بات کرنے سے پہلے دس بار سوچتا ہے کہ نہ جانے ان کا کیا ردعمل ہوگا،اسی طرح بعض باتیں کرتے کرتے لڑ پڑتے ہیں اور بعض لڑتے لڑتے باتیں کرنے لگتے ہیں۔بعض باتیں کرتے ہوئے اس انداز میں ہنستے ہیں کہ بات کی سمجھ تو درکنار،الٹا ان کی ذہنی کیفیت پر شک ہونے لگتا ہے۔بعض باتیں کرتے ہوئے شرماتے ہیں اور بعض کی باتیں سن کر ہم تو کیا یہود بھی شرمانے لگتے ہیں۔بعض باتیں کرتے ہیں اور بعض باتیں بناتے ہیں۔کوئی تو سخن دلنواز ہوتا ہے تو کوئی تاب سخن نہیں رکھتا۔چنانچہ کہنا پڑتا ہے کہ جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔تاہم سنانے والے جب چاہیں جلی کٹی سنا بھی دیتے ہیں۔کوئی قول و فعل کے پکے ہوتے ہیں اور کوئی محض گفتار کے غازی ہوتے ہیں۔اسی طرح کسی کی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے اور کوئی صرف شوشے ہی چھوڑتے ہیں۔اب تو سائنس کافی ترقی کر چکی ہے لہٰذا اب صرف چپاتی ہی چکنی چپڑی نہیں ہوتی بلکہ باتیں بھی ہوتی ہیں جن کے بہکاوے میں آ کر انسان اپنا بہت کچھ لٹا دیتا ہے۔

؎ 　راہ　پہ　ان　کو　لگا　آئے　تو　ہیں　باتوں　میں

اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

کوئی باتوں سے جی بہلاتا ہے تو کوئی محض خیال سے۔ کہ جی بہلانے کو یہ خیال اچھا ہے۔ بعض باتیں انسان کے بس میں نہیں ہوتیں اور بعض اسے بے بس کر دیتی ہیں۔ یہ بھی لطف کی بات ہے کہ جس کے پاس ایمان نہ ہو اسے بے ایمان کہہ دیا جاتا ہے لیکن جس کے پاس کار نہ ہو اسے بے کار اور جس کے پاس بس نہ ہو اسے بے بس کوئی نہیں کہتا۔ یہ ہے ناچمک کا کمال۔ بعض بھری محفل میں خاموش رہتے ہیں اور بعض اپنی باتوں سے محفل لوٹ لیتے ہیں۔ بعض لوگ بہت کچھ کہہ کر بھی کچھ نہیں کہہ سکتے اور بعض کی خاموشی بھی قیامت کی ہوتی ہے۔ بقول شاعر

؎ خامشی کا تو نام ہوتا ہے
ورنہ یوں بھی کلام ہوتا ہے

کہتے ہیں کہ مردہ جب بولتا ہے تو کفن پھاڑتا ہے۔ شکر ہے کہ ہمارے ہاں ایسا رواج نہیں پڑا۔ تاہم مقرر جب لاؤڈ سپیکر پر بولتا ہے تو اپنا گلا اور دوسروں کے کان ضرور پھاڑتا ہے۔ کسی کے بولنے پر یہ تبصرہ بھی کر دیا جاتا ہے کہ بلی تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔ حالانکہ اس میں پریشان ہونے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ کہیں سے دوسری بلی کا بندوبست کر دیں۔

کچھ لوگ دل میں بات کرتے ہیں اور کچھ دل سے بات کرتے ہیں، اور شاعر کو ان کی یہ ادا بہت بھاتی ہے۔ تبھی تو وہ کہتا ہے کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

باتوں کی عادت حضرت انسان کو ایسی پڑی ہے کہ خود تو کیا بے چارے بے زبان طوطے کو بھی اس نے باتیں سکھا دی ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ انسان اپنے منہ میاں مٹھو بنتا پھرتا ہے۔ لیکن یار لوگ اس پر بھی معاف نہیں کرتے اور چھوٹا منہ، بڑی بات کی پھبتی کس دیتے ہیں۔ اس سے بھی عجیب معاملہ یہ ہے کہ انسان سارا دن اپنے جیسے انسانوں سے باتیں کرتا نہیں تھکتا لیکن اللہ کی باتیں سننا یعنی قرآن پڑھنا اور اللہ سے باتیں کرنا یعنی نماز پڑھنا اسے گراں گذرتا ہے۔

؎ باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنیئے گا
کہتے کسی کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

☆☆☆

غذا و صحت

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

صحت مند طرزِ زندگی اپنائیں

آیئے اپنے روز و شب کا جائزہ لیں اور فضول کام اور فالتو باتیں زندگی سے نکال دیں۔ ہم فون پر لمبی لمبی بے مقصد گفتگو کرتے ہیں جو وقت کا زیاں بھی ہے اور غیبت چغلی کا ڈر بھی رہتا ہے۔ فون مصروف اور پیسے کا نقصان الگ۔ اس کے بعد اپنے وقت کو تین حصوں میں تقسیم کریں۔

۱۔ اپنے فرائض کی ادائیگی

۲۔ عبادت

۳۔آرام اور تفریح

تھکے ہوئے جسم کے لیے آرام اور تفریح خوراک کی طرح ضروری ہیں۔اپنی غذا کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ہم پانی کم پیتے ہیں جس کی وجہ سے جسم سے Toxins کا اخراج مکمل طور پر نہیں ہوتا اس سے نہ صرف ہم بیمار ہو جاتے ہیں بلکہ سستی، کاہلی، غصہ، بیزاری، ڈیپریشن پیدا ہوتا ہے۔اس لیے آٹھ سے دس گلاس روزانہ ضرور پئیں۔

اسی طرح نیند بہت ضروری ہے۔دن کی نیند کا وہ لطف یا اثر نہیں ہوتا کیونکہ اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ میں نے رات کو آرام کے لیے بنایا ہے۔رات کو دیر تک جاگنے سے چہرے کی شادابی ختم ہو جاتی ہے، صبح کی نماز قضا ہو جاتی ہے اور سکول یا جاب پر تاخیر سے پہنچتے ہیں۔

نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔

ہفتے میں ایک دفعہ سر میں تیل کی مالش کریں۔اپنے پاؤں، ہاتھوں اور چہرے کا مساج کریں۔گرم پانی سے غسل کریں اور آرام کریں۔

غذا میں نمک، مرچ، گھی، چینی اور اچاروں کا استعمال کم کر دیں۔

السر، بلڈ پریشر، دل کی تکلیف، شوگر اور موٹاپے سے اپنے آپ کو بچائیں۔کوشش کریں کہ کھانے میں صرف ایک ہی سالن ہو۔

ہر کسی سے چوائس نہ پوچھیں، ہمارے بچپن میں یہ رواج نہیں تھا کہ ہر بچے سے پوچھا جائے کہ تم کیا کھاؤ گے۔یہ لاڈ ہمارے مزاج خراب کر دیتا ہے۔

مرغن کھانے کم بنائیں۔ ہفتے میں چار دفعہ گوشت یا چکن یا مچھلی کھائیں، باقی دن دال اور سبزیوں پر گزارا کریں۔

مصالحے کم استعمال کریں۔کوکنگ شوز اور کھانوں کی ورائٹی نے اشتہا بڑھا دی ہے کہ ایسا کچن بھی ہو اور ہر روز ایک نیا تجربہ بھی ہو۔یہ ڈیڑھ انچ گوشت کا ٹکڑا زبان...... کتنے بھی ذائقے چکھ لے، شکر کم کرے گی شکایت زیادہ۔

جبکہ حال یہ کہ جونہی گلے سے نوالہ اترا سب برابر...... ذرا سوچیں کس لیے اتنا اہتمام کیا۔خرچ، وقت اور تھکاوٹ ...... جو بیماری ہوگی یا موٹاپا وہ سود در سود ہے۔

کپڑے کم اور سوچ سمجھ کر بنائیں، دھونے، استری کرنے اور سنبھالنے میں آسانی ہوگی۔

سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹائیں۔

صلہ رحمی کریں۔

اپنے آس پاس ہمیشہ نظر رکھیں کہ کوئی ایسا ضرورت مند ہو جو مانگ نہیں سکتا، اس کی ایسے مدد کریں کہ دوسرے ہاتھ کو پتہ نہ چلے۔

بچوں کے ساتھ وقت گزاریں۔مطالعہ ضرور کریں۔وقت ضائع نہ کریں۔یہ تیزی سے گزر رہا ہے۔ہر جانے والا دن کہتا ہے کہ اب میں تمھاری زندگی میں کبھی نہیں آؤں گا۔

☆......☆......☆

فریدہ خالد

مسواک: دانتوں کا قدرتی معالج

اسلام میں طہارت کو بڑی اہمیت حاصل ہے بلکہ حدیث میں اسے ''نصف ایمان'' کہا گیا ہے۔ دانتوں کی صفائی اور ستھرائی کے لئے مسواک کرنا ایک بہترین عمل ہے۔ مسواک نہ صرف منہ کے تمام حصوں یعنی دانت، زبان، حلق، گلا، سانس کی نالی اور خوراک کی نالی کے ابتدائی حصوں کے امراض کے لیے بے حد فائدہ مند ہے بلکہ ثواب کمانے کا بھی ذریعہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''مسواک منہ کی پاکیزگی اور رب کی رضامندی کا ذریعہ بھی ہے''۔ (متفق علیہ) آپ ﷺ کی زندگی کا آخری عمل بھی مسواک کرنا تھا۔

مسواک ایک چھوٹی سی ٹہنی ہوتی ہے جو دانتوں کو نقصان پہنچائے بغیر انکی درمیانی جگہ کو صاف کرتی ہے۔ یہ زیادہ تر پیلو، زیتون، تمبر اور نیم کے درختوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ طبی تحقیق کے مطابق مسواک میں کئی ایسے اجزا پائے جاتے ہیں جو دانتوں کے کئی ایک مسائل کو حل کرنے مثلاً مسوڑھوں سے خون آنا، دانتوں کی میل، منہ کی بدبو اور p l a q u e وغیرہ میں مفید ہے۔ اس کے ریشے نرمی سے لیکن موثر طریقے سے دانتوں کو صاف کرتے ہیں اور مسوڑھوں اور E n a m e l (دانتوں کی اوپری سفید تہہ) کو نقصان پہنچائے بغیر دانتوں کی پیلاہٹ اور داغ دھبے دور کر کے انہیں سفید کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسواک کی جراثیم کش صلاحیت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ یہ ہر طرح کے جراثیم پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کے استعمال کے بعد ۱۲ گھنٹے تک منہ کو جراثیم سے صاف رکھا جا سکتا ہے اسی لئے یہ منہ کے کئی انفیکشنز کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ بیک وقت ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ اور ماؤتھ واش کا کام کرتی ہے اس طرح کم خرچ بالا نشین بھی ہوئی۔

امام شافعی نے ذہانت میں اضافے کے لیے چار چیزوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک مسواک کرنا ہے۔

نبی ﷺ کی زندگی میں مسواک کی بڑی اہمیت پتہ چلتی ہے۔ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا، جب بھی میرے پاس جبرائیلؑ آتے تو مجھے مسواک کا حکم دیتے مجھے خطرہ لاحق ہو گیا کہ میں اپنے منہ کی اگلی جانب چھیل نہ لوں (بیہقی)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا، اگر میں اپنی امت کے لیئے مشکل نہ جانتا تو اپنی امت کو عشاء کی نماز میں تاخیر کرنے اور ہر نماز سے پہلے مسواک کرنے کا حکم دیتا (بخاری)۔

اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا، مسواک استعمال کرو یہ منہ کو صاف کرتی ہے اور اللہ کو خوش کرتی ہے، جبرائیل نے مجھے مسواک کے استعمال پر اتنی تاکید کی کہ مجھے خوف ہوا کہیں یہ مجھ پر اور میری امت پر فرض نہ ہو جائے، اگر مجھے اپنی امت پر سختی کا خوف نہ ہوتا تو میں اسے اپنی امت پر فرض کر لیتا (ابن ماجہ)۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، مسواک کا استعمال یقیناً منہ کی صحت کے لئے فائدہ مند ہے اور اللہ کی خوشی کا باعث ہے یعنی اللہ ان لوگوں سے خوش ہوتا ہے جو مسواک کا استعمال کرتے ہیں (بخاری)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ گھر میں داخل ہو کر سب سے پہلے مسواک کرتے (مسلم)۔

آپؐ جب بھی گھر سے نکلتے تو مسواک فرماتے (کشف الغم)۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں، میں رات کو سونے سے پہلے، اٹھنے کے بعد، کھانے سے پہلے اور بعد میں مسواک کرتا ہوں جب سے میں نے نبی ﷺ سے اسکی تاکید سنی ہے (احمد)۔

حضرت علیؓ کا فرمان ہے، تمہارے منہ قرآن کا راستہ ہیں لہٰذا مسواک سے اپنے منہ اچھی طرح صاف کرو (ابنِ ماجہ)
اس کے علاوہ آپ ﷺ روزے میں کئی مرتبہ مسواک کیا کرتے تھے (ابن ماجہ)۔
اس سنت پر ہمیں بھی عمل کر کے اپنے لیے دنیاوی ہی نہیں اخروی فائدے بھی اٹھانے چاہئیں۔

☆☆☆

بتول میگزین

ننھا بچہ

(شاہدہ ناز قاضی)

اللہ سے ڈرو
بچپن سے اُس نے یہی سنا تھا
مگر کیوں
اس کے چھوٹے سے دماغ نے سوچا
میں اس سے کیوں ڈروں
میں تو اس سے محبت کرتا ہوں
شعور پختہ ہوا
سوچوں کی دنیا وسیع ہوئی
کائنات کے راز کھلے
تو چپکے سے ڈر اُس کے اندر بھی آ کر بیٹھ گیا
تب اُسے احساس ہوا
محبت ڈر بھی پیدا کرتی ہے
لیکن یہ ڈر خود محبتوں کا پیدا کردہ ہے
اے محبوب تیری ناراضگی کا ڈر
تیری خفگی کا ڈر
تیرے در سے دھتکارے جانے کا ڈر
تیرے عذاب کا ڈر!

☆☆☆

حریم ادب کی گرما گرم نشست

(ام ایمان۔کراچی)

جون میں حریم ادب کی معمول کی نشست کراچی کے حالات کے باعث کینسل کرنی پڑی۔ جون کا مہینہ گرمی کی شدت کا مہینہ ہوتا ہے۔ ''بھائی'' چونکہ برطانوی تحویل میں لے لیے گئے تھے لہٰذا گرمی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ بازار اور سڑکیں سنسان تھیں کیونکہ غیر اعلانیہ ہڑتال کی کیفیت پیدا کر دی گئی تھی۔ سڑکوں پر بعض مقامات پر بھائی کی برطانوی پولیس کے ہاتھوں گرفتاری پر دھرنا دیا گیا تھا۔ ان دھرنوں کے شرکاء کیسے سمیٹ کر لائے جاتے ہیں، وہ بازاروں کے دوکانداروں سے پوچھیے جہاں ہر دکاندار کو ایک فرد کے علاوہ سب کو حاضری کا حکم ہوتا ہے ورنہ ڈاکے یا آگ لگانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔

خدا خدا کرکے یہ سلسلہ تھما تو حریم ادب کی نئی تاریخ طے کر دی گئی۔ گرمی تو خیر اس دن بھی بہت تھی لیکن ادب کی لطافت نے اس کی شدت میں کمی کر دی تھی۔

تلاوت اور ابتدائی ''دو باتوں'' کے ساتھ پروگرام کا آغاز کر دیا گیا۔ عشرت لطافت نے اپنی نعت ترنم سے سنائی تو سماں سا بندھ گیا۔ خوبصورت نعت اور خوبصورت آواز......طوبیٰ احسن نے رمضان کی مناسبت سے ایک کہانی سنائی جس کا بنیادی خیال ''دل کی صفائی'' تھا جس میں خواتین کو رمضان سے پہلے گھر کی صفائی کے ساتھ دلوں کی صفائی کی طرف بھی متوجہ کیا گیا تھا۔ کہانی میں انھوں نے مشکل الفاظ اچھی طرح استعمال کیے تھے۔ مثلاً متوحش، لجاجت، متنفر، دوبھر وغیرہ۔ خاص بات یہ تھی کہ انھوں نے صحیح تلفظ کے ساتھ انھیں پڑھا بھی...... جو لوگ اکثر غلط پڑھ لیتے ہیں۔

سعیدہ شاہ بچوں کی کہانی ''سرخ چاند'' سنانے کے لیے لائی تھیں۔ نئی شریک ہیں۔ لکھنا شروع کیے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ امید ہے تیزی سے بہتری کی طرف آئیں گی۔ ''نذیر جتوئی'' بلوچ ہیں لیکن ان کی تحریر انتہائی رواں اور تسلسل کے ساتھ تھی۔ رمضان میں کی جانے والی نیکیوں کی تفصیل اُن کے مضمون میں تھی۔ چھوٹے جملے ایسے ترتیب دیے تھے کہ نثر میں نظم کا مزہ مل رہا تھا۔ اگلی مصنفہ عشرت لطافت تھیں محترمہ شاعری کے علاوہ نثر بھی لکھتی ہیں۔ رمضان سے متعلق ''مضمون نما کہانی'' تھی جس میں قرآن سے جڑ جانے کے بعد تبدیلی کا ذکر کیا گیا تھا۔

رمیصا عبدالوہاب کی خوبصورت نظم نے آخر میں بھرپور دعوت کے بعد میٹھے کا کام کیا، کہتی ہیں ؎

کہوں گی بڑی بات چھوٹا ہے منہ!
اگرچہ نہ رینگے گی کانوں پہ جوں
کہانی کہوں یا فسانہ کہوں
جو گزرے گی ساعت زمانہ کہوں

ربیعہ عبدالمالک نے مراسلہ سنایا......فرحی نعیم کا افسانہ وقت کی تنگی کے باعث سنا نہ جا سکا جس کا سب کو افسوس رہا۔ بہرحال حریم ادب کی نشست تھی کہ ایک رسالہ تھا کہ جس کو سن لیا گیا۔ ہر قسم کی تخلیقات موجود تھیں۔

آخر میں فرحت طاہر نے جو خصوصی طور سے شرکت کرنے تشریف لائی تھیں حریم ادب کی اس نشست پر مختصر تبصرہ کیا۔ چائے کے ساتھ سموسوں اور مٹھائی نے اختتامیہ بھی پرلطف بنا دیا۔

☆☆☆

اُف یہ رسمیں!

(صدف سردار)

چند دنوں قبل مجھے اپنی عزیزہ کے گھر چہلم پہ جانے کا اتفاق ہوا۔ چہلم وغیرہ بھی اب ہمارے ہاں باقاعدہ رسم ورواج میں داخل ہے اور جس شان کے ساتھ اس کا اہتمام کیا جاتا ہے بہت افسوس ناک ہے۔ لیکن جس چیز نے مجھے قلم اٹھانے پہ مجبور کیا وہ چہلم نہیں بلکہ چہلم پہ کی جانے والی ایک رسم ہے۔

بارہ بجے کے قریب ہم بہن بھائی اپنے والد اور خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ اپنی تایا زاد بہن کے گھر اُن کی ساس کی رسمِ چہلم پہ گئے سب کی طرح ہمارے ہاتھوں میں پھلوں کے بڑے بڑے شاپر تھے۔ لیکن ان پھلوں کے شاپر کے علاوہ کچھ اور شاپر بھی دیگر خواتین کے ہاتھوں میں تھے۔

جب ہم لوگ پہنچے تو نعت خوانی جاری تھی گلی میں بہت بڑی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ ٹینٹ لگا کے تقریباً ساری گلی کو گھیرا گیا تھا۔ ماشاءاللہ سے نعت خواں صاحب خوب زور وشور سے لاؤڈ سپیکر پہ نعتیں پڑھ رہے تھے۔ ظہر سے عصر کا وقت ہو گیا لیکن کوئی نماز کا اہتمام نہیں کیا یا۔ عصر کے بعد مولوی صاحب نے ختم دلایا اور اللہ اللہ کر کے پورا دن گزرے کے بعد شام کو کھانا پیش کر دیا گیا۔

کھانا، پھل، نعت خوانی، نماز سے لاپروائی یہ تو معمول کی بات ہے لیکن غیر معمولی بات یہ تھی کہ کھانے کے بعد سب خواتین ایک بڑے ہال میں جمع ہو گئیں۔ جب یہ جم غفیر جمع ہو گیا تو میری تایا زاد بہن نے سب سے پہلے سب عورتوں سے ہم لوگوں کا یعنی اپنے میکے والوں کا تعارف کروایا اور بتایا کہ یہ جوڑے میرے میکے سے میرے، میرے خاوند، اور میرے بچوں کے لیے ہیں۔ اور باقاعدہ جوڑوں کو لہرا لہرا کے تمام خواتین کو دکھایا جیسے شادیوں میں ''بری دکھایا'' کرتے ہیں اور اس کے بعد ان کی والدہ نے اُنھیں دس ہزار روپے دیے۔

پھر اُن کے بعد دوسری تیسری اور چوتھی بہو کے گھر والے اپنے اپنے جوڑے، رقم اور سونے کے زیورات دیتے رہے۔

آپ لوگ سمجھ تو گئے ہوں گے یہ رسم کیا ہے۔ رسم یہ ہے کہ جب بہو کا سسر یا ساس انتقال کر جاتے ہیں تو اُس کے گھر والے (میکے والے) اس کو ایک بار پھر جہیز دیتے ہیں۔ بیٹی کو بوجھ اللہ تعالیٰ نے تو نہیں بنایا لیکن ہم لوگوں نے اپنی قائم کردہ ان فضول رسوم سے بیٹی کو بوجھ خود بنالیا ہے۔ واپسی پہ میں سوچ رہی تھی اس رسم کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ معلوم نہیں یہ کب سے جاری ہو گی اس کی کیا ضرورت ہے؟ ضرورت شاید یہ ہے کہ ہم اپنے روپے پیسے کا رعب جھاڑ سکیں، دکھاوا کر سکیں۔ ان لوگوں پر نفسیاتی برتری رکھنا چاہتے ہیں جن کی مالی حیثیت ہم سے کم ہے۔ یا یہ کہ لڑکی والوں کو ہر موقع پر لڑکی کے والدین ہونے کی سزا دی جائے۔

سورۃ القصص آیت نمبر ۸۳ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''یہ آخرت کا گھر ہے جسے ہم نے ان لوگوں کے لیے بنایا ہے جو زمین میں تکبر نہیں کرتے اور فساد نہیں کرتے اور بہتر انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔''

کاش کہ ہم ہدایت پائیں!

☆☆☆

رازِ زندگی کہہ دے

(نوشین سعید۔کراچی)

یادوں کے افق کو پار کرتے، ماضی کے اوراق کو پلٹتے پلٹتے نگاہیں ایک سنہری باب پر جا ٹھہرتی ہیں۔ذہن کے پردے پہ ایک روشن تصویر ابھر آتی ہے۔ایک حسین دور کا عکس لہراتا ہے......مسلمانوں کے عروج کا دور......اسلام کے غلبہ کا دور......امن و آشتی،سکون و محبت کا دور...... یہ وہ دور تھا جب ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم تھی مسلم وغیر مسلم یکساں اطمینان وسکون سے رہا کرتے تھے۔حاکم خود کو رعایا کا خادم سمجھتے تھے۔انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کوئی قاضی کسی بادشاہ کو عدالت میں کھڑا کر سکتا تھا۔بھائی چارے کی فضا تھی۔جانیں محفوظ،عزتیں اور ملکیتیں مامون ہوا کرتی تھیں۔بیت المال کے خزانے بھرے تھے مگر کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ ہوتا تھا۔رات کی تاریکی میں ایک اکیلے شخص کو بہت قیمتی تاج ملتا تو وہ اُسے بیت المال میں لوٹا آتا۔مفتوحہ ملک کے غریب غیر مسلم رعایا کا فدیہ خود بادشاہِ وقت نقاب میں راہ کرادا کرتا۔حاکم وقت رات کو بھیس بدل کر رعایا کا حال معلوم کرنے نکلتا۔اپنی کمر پہ راشن لاد کر کسی غریب کے گھر پہنچا دیا کرتا تھا۔

بہت دلکش ہے یہ تصویر......ایک جنگ نظیر معاشرہ......ایک تصوراتی دنیا۔وہ کیا چیز تھی جسے پاکر وہ مسلمان اتنے پرسکون تھے اور وہ کیا چیز تھی جسے کھو کر آج کے مسلمان بہت مضطرب و زبوں حال ہیں۔تاریخ بتاتی ہے کہ عہدِ رفتہ کے مسلمانوں کے عروج کا سبب یہی تھا کہ وہ صرف ایک خدا سے ڈرتے تھے۔کسی حکمراں کا جاہ وجلال،کسی شہنشاہ کا رعب و دبدبہ انھیں متاثر نہیں کر سکتا تھا۔وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر کاربند تھے۔ہر باطل قوت کے آگے آہنی دیوار ثابت ہوتے تھے۔کسی حکمراں کا زور وجبر انھیں نہیں جھکا سکتا تھا۔وہ تختۂ دار پر بھی کلمۂ حق کہا کرتے تھے۔

جبھی تو اُن کی دھاک اہلِ باطل کے دلوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔قیصر وکسریٰ کی سلطنتیں اُن کے قدموں میں تھیں۔اُن کی صدائے تکبیر سے جبل بھی دہل جایا کرتے تھے۔

ان کی اذانیں پرسوز تھیں۔اُن کی دعاؤں میں اثر تھا۔اُن کا کردار،ان کے افکار صفحۂ ہستی پہ نقش تھے۔

اور آج کے مسلمانوں کی زبوں حالی کا بڑا سبب یہی ہے کہ انھوں نے دنیا سے ڈرنا شروع کر دیا۔اپنے فیصلوں اور معاملات میں ایک خدا کے بجائے قوم،قبیلہ،خاندان کے مفاد کو مقدم رکھنا شروع کر دیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ اب نہ ان کی ہیبت دنیا کی قوموں پر باقی ہے نہ اُن کی دعاؤں اور آہوں میں اثر رہا ہے۔باطل اب خود اُن کو ڈراتا ہے اور اُن کا حال یہ ہے کہ وہ سمندر میں جھاگ کے برابر ہونے کے باوجود مغلوب ومحکوم ہیں۔وہ قوم جس نے کبھی دنیا پہ حکمرانی کی تھی۔اپنے سے بڑی قوت سے اپنا لوہا منوایا تھا۔آج وہی قوم اپنے سے تعداد میں بہت کم لوگوں کی محکوم بن گئی ہے۔

جس کے اسلاف کے کارنامے زمانے کو ازبر تھے۔جن کے صالح کردار کی گواہی اُن کے دشمن بھی دیا کرتے تھے۔آج اُس قوم میں اُن اوصاف کی جھلک بھی نہیں ملتی جو کبھی اُس کے اسلاف کا خاصہ تھے۔

☆☆☆

اصل حقدار

(عائشہ انوار،کراچی)

میں شادی میں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔دوسری طرف ماہم تھی اور پوچھ رہی تھی کہ میں کس وقت تک شادی ہال پہنچ جاؤں گی۔

’’بس نکل رہی ہوں کچھ دیر میں‘‘۔ میں نے جلد بازی میں جواب دیا۔

ماہم نے کہا: ’’جلدی آ جاؤ میں یہاں پہنچ گئی ہوں اور نادیہ بھی پارلر سے آ چکی ہے‘‘۔

’’اُوہ! بس آ رہی ہوں تم فون تو رکھو‘‘۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ تیاری مکمل کر کے اچھی طرح حجاب لیا کیونکہ میں جانتی تھی کہ وہاں مکس گیدرنگ ہی ہوگی۔

آج میری سب سے گہری دوست کی شادی تھی۔ مجھے بہت خوشی تھی۔ نادیہ دلہن بن کے ہال میں پہنچ چکی ہے۔ یہ سن کر میرا دل مچل گیا کہ جلدی سے اس کو دلہن کے روپ میں دیکھ لوں۔ ہم تینوں نے ایک ساتھ ہی یونی ورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لی تھی۔ آج دیکھتے ہی دیکھتے تینوں میں سے ایک کی رخصتی کا دن آ گیا۔

ہال میں داخل ہوئی۔ انتظام کس قدر خوب صورت تھا۔ ہر طرف پھولوں اور جھلملاتی بتیوں سے خوب ہی سجاوٹ کی گئی تھی۔ سامنے ہی آنٹی نظر آئیں۔ ان سے سلام دعا کر کے میں ڈریسنگ روم کی طرف دوڑی جہاں ماہم اور چند رشتہ دار مزید دلہن کے گرد گھیرا ڈالے تھے۔ آج تو میری دوست ایک خوب صورت سی معصوم سی پری لگ رہی تھی۔ اُس کا عروسی جوڑا، میک اَپ، مہندی، سب کچھ بہت پرفیکٹ تھا۔ ہم سب ملے جلے، باتیں ہوئیں، بس بارات کا انتظار تھا۔

میں نے نادیہ سے کہا: ’’آج تو دولہا بھائی دیکھتے ہی رہ جائیں گے‘‘۔ یہ سن کر وہ ہنس دی۔

کچھ دیر بعد نادیہ کی چھوٹی سی کزن نے آ کر بتایا کہ بارات آ گئی ہے۔ سب میں ہلچل مچ گئی۔ سب ہی باہر بھاگے۔ میں اور ماہم نادیہ کے پاس ہی بیٹھے رہے۔ ابھی تو دولہا والوں نے باہر ہی کافی رسمیں، ڈھول ڈھمکا کرنا تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر چار سے پانچ لڑکے ہاتھوں میں مووی کیمرے لیے کھڑے تھے۔ انہوں نے پیغام دیا کہ دلہن کو باہر لے آئیں۔ جب تک بارات اندر آئے ہم فوٹو سیشن کریں گے۔

نادیہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور لڑکوں کے پیچھے چل پڑی۔ میں نے حجاب اچھی طرح اُوڑھ لیا اور ہم دونوں سہیلیاں ان کے پیچھے اسٹیج کی طرف چل پڑیں۔

نادیہ کو اسٹیج پر بٹھا کر کھڑا کر کے ہر قسم کے پوز سے تصاویر بنائی جانے لگیں۔ پانچ سے چھ لڑکے نادیہ کے اردگرد منڈلاتے رہے۔ کبھی اس کا ڈوپٹہ ٹھیک کرتے تو کبھی غرارہ پاؤں کے پاس پھیلاتے یہاں تک کہ وہ لڑکے انتہائی قریب اس کے ہر پوز کی تصاویر بناتے رہے اور میری دوست ان کے اشاروں پر چلتی رہی۔ تصویروں کی کھچ کھچ مسلسل پندرہ منٹ تک آتی رہی۔ یہ منظر دیکھ کر میرے تو آنسو جاری ہوگئے۔ میری نظروں میں اس کی خوبصورتی اور معصومیت ماند پڑتی جا رہی تھی لیکن اس کے برعکس نادیہ کے گھر والے بہت خوش تھے کہ ان کی بیٹی کا فوٹو سیشن بہت شاندار ہو رہا ہے۔

تصاویر کا مرحلہ ابھی ختم ہوگیا تھا کہ بارات اندر آتی دکھائی دی اور مووی والے اب ان کی آمد کیمرے میں قید کرنے لگے۔ میں اور ماہم بھی باہر کھڑے ہو کر دولہا کو دیکھنے لگے۔ اپنی پوری سج دھج کے ساتھ رشتہ دار خواتین کے جھرمٹ میں دولہا کو آتا دیکھ کر میں سوچنے لگی کہ دلہن کی تیاری، اس کی سج دھج، بناؤ سنگھار اور خوبصورتی کا اصل حقدار تو اب آیا ہے۔ یہ ہی تو وہ واحد شخص تھا جس کے لیے دلہن تیار ہوئی تھی اور جس کو شرع نے یہ حق دیا تھا کہ وہ اپنی دلہن کو دیکھے مگر......

اس اصل حقدار کے آنے سے پہلے ہی دلہن کی منہ دکھائی کئی غیر محرم اور بدنظروں نے انجام دے لی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے دلہن کا رُوپ پھیکا پھیکا سا لگنے لگا۔

☆......☆......☆